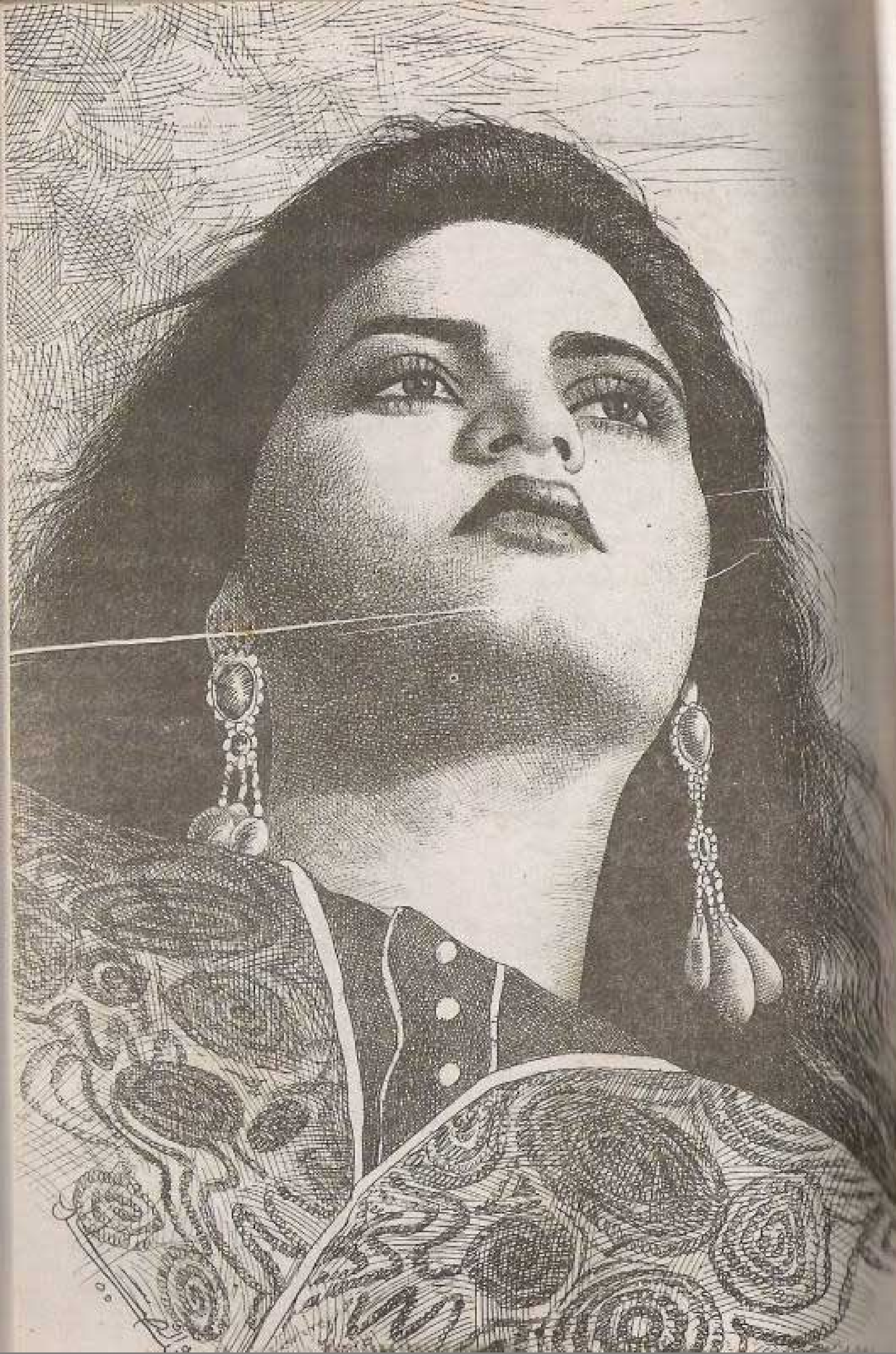


مکمل ناول

اے میرے بابل

آسیہ رزاقی

بڑے کمرے سے موسیقی کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ پرانا ریکارڈ — پرانا گانے والا — نانا نے کیسٹ لگا رکھا تھا۔

؎ بابل مورا نیہر چھوٹو جائے
بابل مورا نیہر چھوٹو ہی جائے

گھسا ہوا ریکارڈ۔

"لگتا ہے، آج پھر دادا، دادی کی جنگ ہوئی ہے۔" ہما اندازے قائم کرنے میں ماہر تھی۔

"ہاں! اسی لیے تو آج نانا جی کو اپنا نیہر یاد آ رہا ہے۔ بے چارے کتنے اکیلے اکیلے ہیں۔" ثنا نانا کے لیے اُداس ہو گئی۔ "پتا نہیں یہ نانی ان سے اتنا کیوں لڑتی ہیں — ذرا ذرا سی بات پر نکتہ چینی اعتراض — اُف! نانا جی کی کیا زندگی ہے — بے چارے اونچی آواز میں بولتے بھی نہیں اور نانی کی آواز — خدا کی پناہ، پورے گھر میں گونجتی ہے۔"

"بڑھاپا ہے اور بڑھاپا بچپن کی ایک قسم ہوتا ہے چھوٹے بچے بھی لڑتے ہیں، بڑے بچے بھی۔" اختر نے بڑی رازداری سے یہ بات بتائی تھی۔ نانی کو مگر — ہر وقت ان کے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔ یوں کرو، یوں نہ کرو۔

"نوکروں سے بے تکلفی کی ضرورت نہیں، وہ بدتمیز ہو جاتے ہیں۔"



"بچوں کو کیوں گھورتے ہو۔ ہر بات میں بچوں کو نصیحت نہ کرو۔ یہ ٹوکا ٹاکی بے وقت کی راگنی کی طرح بے اثر ہوتی ہے۔"

"اچھا، یہ آج داڑھی کو مہندی کے بجائے خضاب سے کیوں کالا کیا ہے۔ میاں تمہاری عمر اب ان رنگینیوں کی نہیں رہی۔ کونے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کی ہے۔ مغفرت طلب کرو۔ اللہ سے اپنے لیے معافی اور بچوں کی درازیٔ عمر اور ترقی کی دعا مانگو۔"

"اور یہ تم صبا کو کیوں ڈانٹ رہے تھے۔ ایک ذرا سی ہنسی تھی، وہ کوئی تم پر قہر بن کے تو ٹوٹی نہیں کہ آگ بگولہ ہو گئے۔ ذرا صبر اور تحمل سے کام لیا کرو جو زندگی بھر نہیں کیا تم نے۔"

نانا اس دوران ٹکر ٹکر بیگم کی صورت دیکھا کرتے نانی کی نصیحتوں، فضیحتوں کے آگے ان کی ایک نہ چلتی۔ سوال یہ ہے کہ آخر نانی ان سے کتنی چھوٹی تھیں یا پھر بڑی تھیں۔ ان نصیحتوں کے لیے ان کا بہت چھوٹا ہونا یا بہت بڑا ہونا لازمی تھا۔ چھوٹا ہونا اس لیے کہ اپنے تئیں وہ نانا کی اس عمر تک نہ پہنچی ہوں کہ "بڑھاپا، بچپن ایک" والا مقولہ ان پر صادق آتا۔ عمر میں بڑی ہونے کی صورت میں وہ ان پر بزرگانہ رعب گانٹھنے کی حقدار تھیں۔

گھر بھر میں اختر ہی نانی سے، یعنی اپنی دادی سے سب سے زیادہ بے تکلف تھا، لاڈلا جو تھا۔ تین بہنوں کا اکیلا بھائی، مگر اپنے دادا سے اس کی جان ہوا ہوتی تھی۔ وہ جب اس کو گھورتے تو وہ گڑبڑا جاتا۔ اختر میں یوں تو کوئی بُرائی نہ تھی۔ بس وہ آرام طلب تھا۔ اور اس کی دوستی اپنے کسی بھی کزن سے نہ تھی، بلکہ وہ لڑکیوں میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ ہما اور صبا تو اس کی بہنیں تھیں، ان سے بھی دوستی زیادہ تھی، مگر ثنا تو کزن تھی اور اوّل دن سے وہ اس کے ہر مسئلے کا حل چٹکیوں میں بتا دیتا۔ اس کے علاوہ اپنے چچا صداقت کی بیٹیوں سے دوستی کم، دشمنی زیادہ والا معاملہ تھا۔ حالانکہ مانہ اس کی منگیتر تھی اور فضی، وہ تو تھی بھی تیز طرار— اختر کی اس سے کم ہی بنتی۔ خاندان کی دوسری لڑکیاں— یا ہما، صبا کی سہیلیاں جب آتیں اختر بہت خوش ہوتا، بلکہ مانہ، فضی کی سہیلیوں کو خوش آمدید کہنا اپنا فرض سمجھتا۔ یوں بھی اپنی زندہ دلی، خوش مزاجی اور شخصی وجاہت کی وجہ سے وہ لڑکیوں میں خاصا مقبول تھا۔ چھوٹے چچا کی تو کوئی لڑکی اتنی بڑی نہ تھی، بلکہ ان کے تو لڑکے بھی چھوٹے تھے ان سے البتہ اختر کا برادرانہ تعلق خاصا گہرا تھا۔

اختر کے لڑکیوں میں بیٹھ کر قہقہے لگانے کی عادت سے دادا سخت بیزار تھے، مگر دادی یہاں بھی اختر کی حمایت کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا، اختر نے دادا سے ہی رنگین مزاجی لی ہے۔

"تو تم پر پڑا ہے اس معاملے میں، ہو بہو وہی لچھن۔ ارے میں نئی شادی شدہ دلہن تم کو لڑکیوں میں ہی ہی— ٹھی ٹھی کرتے دیکھا کرتی اور کڑھا کرتی، مگر زبان پر شرم و حیا کے تالے تھے۔ اس زمانے میں ساس سسر کے سامنے نظر اٹھا کر دیکھنے کا رواج نہ تھا۔ بولنا، بات کرنا درکنار۔"

"تو نانی اماں! نانا کیا اپنے ماں باپ کے سامنے ہی—؟" اکرم شوخی سے بولا۔

"ارے ان کو شرم کہاں تھی، جانے کس بے حیا کے ہاتھ سے گھٹی ملی تھی۔"

"دیکھو— دیکھو بچوں کے سامنے، شرم تو تم کو نہیں ہوں، ہوں۔" نانا جھلا کر آگے بڑھے، تیزی میں کسی میز سے ٹکرائے۔

"سنبھل کے میاں، بڑھاپے میں ہاتھ پیر نہ تڑوا لینا، کون کرے گا خدمتیں؟"

"کیوں، یہ اولاد کس لیے ہے"؟ دادا غرائے۔

"اور اولاد کی اولاد ہے جو گھر بھرا ہوا ہے، کیا صرف منہ دیکھنے کے لیے ہیں یہ سب؟"

"اے لو، بھرے منہ سے ٹوک دیا، توبہ کرو۔ توبہ! اللہ میرے گھر کی بہار یونہی قائم رکھے۔"

دادی کے خیال میں اختر میں کئی خوبیاں تھیں، جن کا کوئی مقابلہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اوّل، وہ ان کے سب کے بڑے صاحبزادے کے بیٹے تھے۔ دوسرے واحد اولادِ نرینہ۔

تیسری خوبی یہ کہ ان کے دوسرے بیٹے صداقت کے ہونے والے داماد۔

صداقت کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ ان کی بیوی کا

کہنا تھا کہ میری بیٹیاں، بیٹوں سے بڑھ کر ہیں۔ اس خوبی کو جلا دینے کے لیے وہ بیٹیوں کو خوب شہ دیتیں۔ ان کی ہر خواہش فوراً پورا کرنا فرض سمجھتیں۔ ان کی بدمزاجی کو ان کا حق گردانتیں۔ ان کے طرزِ عمل سے سب ہی اختلاف رکھتے تھے۔ اس طرح میاں صداقت کا کنبہ کچھ الگ تھلگ سا ہو رہا تھا، جس کی صداقت کی بیوی کو پروا نہ تھی۔

ثنا اپنے نانا کی لاڈلی تھی۔ البتہ نانی سے وہ دبتی تھی۔ اس نے یہ تاڑ لیا تھا کہ جو عورت اپنے شوہر کو ڈانٹ سکتی ہو، وہ زبردست ہے۔ اور جو بیٹوں پر حاوی۔ پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کو جب چاہے سب کے سامنے کچہری میں کھڑا کر دے۔ اس کی طاقت اور قوت کے کیا کہنے۔ وہ نانی سے الگ الگ رہتی کہ اس کی ذرا سی خطا کہیں ان کی نظر میں بڑا جرم نہ بن جائے اور سب کے سامنے اس کی "بے عزتی" نہ کر دیں۔

اور اُسے اپنے بچپن کی بہت سی باتیں یاد نہیں تھیں۔ ٹک کر ایک جگہ رہنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ مختلف جگہوں کے خاکے ذہن میں بنتے تھے— مگر واضح تو بس یہاں آنے سے پہلے کا زمانہ اور مقام یاد تھا۔ کچھ عرصہ یا کافی عرصہ وہ لندن میں بھی رہی۔ ماموں کے ہاں۔

شرافت ماموں نام کے عین مطابق شریف اور محبت کرنے والے تھے۔ انہوں نے اسے بڑے پیار سے اپنے پاس رکھا۔ اسکول میں داخل کرایا، پھر وہ کینیڈا چلے گئے۔ وہاں سے سعودی عرب، ہر جگہ وہ ساتھ رہی۔ آخر میں پھر لندن آ گئے۔ اب اُسے ایک ہاسٹل میں داخل کیا گیا۔

ماموں کی طرح ممانی بھی اس سے محبت کرتی تھیں۔ نہ جانے کب اسے اور اس کی امی کو ماموں اپنے پاس لائے تھے۔ ممانی نے بتایا تھا کہ انہیں بغرضِ علاج لایا گیا تھا کیونکہ ان کی بیماری خاصی پیچیدہ ہو گئی تھی، مگر— ایک لمبے علاج کے بعد— وہ وہیں ماموں کے پاس فوت ہو گئیں۔ اور ثنا کو ممانی نے اپنے پاس رکھ لیا اور کبھی اسے ماں کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔

ثنا کو اپنی امی یاد تھیں، مگر اس کا ان کے ساتھ وقت کم ہی گزرا تھا۔ اب غور کرتی تو اسے بیمار ماں کا لاغر جسم اور نحیف لرزتی آواز یاد آتی۔ ماں کی ممتا میں ڈوبی شہد آگیں آواز یا ان کے جسم کی حرارت کا تصور تک نہ تھا۔ کبھی وہ ممانی سے لپٹتی، تو ماں کی یاد آتی۔ وہ شکوہ کرتی تو ممانی اسے بتاتیں۔

"وہ تم سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ اتنا پیار کہ شاید ہی کوئی ماں کر سکے گی، مگر بیماری کے سبب تم کو ان سے دور رکھا جاتا تھا۔"

پھر ماموں، ممانی نے پاکستان آنے کے لیے رختِ سفر باندھا تو ثنا بھی ان کے ساتھ آ گئی۔ یہاں اتنے بہت سے رشتے دار تھے کہ وہ سب کی شکلیں بھی کئی دن یاد نہ رکھ سکی، مگر ایک ہی گھر میں بہت سے کزنز کا ہجوم بہت اچھا لگا اور جب نانا، نانی نے اسے رکنے کے لیے کہا تو اسے اعتراض نہ ہوا۔ صبا اور ہما اس کی تقریباً ہم عمر تھیں۔ بہت جلد دوستی ہو گئی۔

لندن میں اس نے خاصا ہنگامہ خیز وقت گزارا تھا۔ اسکول میں ہی اس قدر کھیل کود، تفریح، آئے دن پکنک کا سلسلہ— پھر ممانی خود سیر و تفریح کی بے حد دلدادہ— ان کا حلقۂ احباب بے حد وسیع تھا اور وہ جہاں جاتیں ثنا کو ضرور ساتھ لے جاتیں۔ چونکہ چھٹی کے دن ہی تفریح ممکن ہوتی یا کہیں پر تقریب ہوتی تب بھی چھٹی کے دن کے لحاظ سے اسے کچھ دن لندن بہت یاد آیا۔ خصوصاً ممانی کا اپنائیت والا رویہ اور ماموں کا مشفقانہ سلوک۔

یہاں شروع میں تو سب نے اس کا بہت خیال رکھا، پھر سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ نانی بھی اس سے کچھ دور دور ہو گئیں— وہ خود بھی پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ اسے بہت محنت کرنا پڑی تھی۔ اگر صبا، ہما اور اختر اس کی مدد نہ کرتے تو وہ بہت پیچھے رہ جاتی، مگر اب شکر تھا کہ وہ چل نکلی تھی اور ہما کے ساتھ تھی۔

بن یامین— یہ نام ہی نہیں، صورت بھی اجنبی تھی۔ ملے ایک سال ہو گیا تھا۔ آج پہلی بار

دیکھا۔ کچن میں چائے بنا رہا تھا، پھر اس نے مگ میں چائے انڈیلی، تو بس اٹھلائے اور ثنا کو دیکھ کر منہ بنایا، جیسے کڑوی گولی نگلنی پڑی ہو۔ ایک تو حلیہ ہی محترم کا عجیب تھا اور قد و قامت ڈرا دینے والا۔ لمبا قد، چوڑے شانے، گھنے اور گردن تک کے بال۔ پھر اس پر ڈھیلے ڈھالے کپڑے۔ ثنا اسے دیکھ کر رک گئی۔

یہ کون ہو سکتا ہے۔ اتنا بے تکلف کہ کچن میں کھڑا چائے بنا رہا ہے اور ہما نے زور دار طریقے سے سلام کیا۔ اُدھر سے معمولی جنبشِ ابرو سے جواب آیا۔

ثنا نے کہنی ماری۔ ہما کے تعارف کرانے سے پہلے ہی اِدھر سے بھاری آواز میں کہا گیا۔

”میرے بارے میں جاننے کی کوشش نہ کرنا جل کر راکھ ہو جاؤ گی۔“

اور مگ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

”یہ بن یامین ہیں۔ منجھلی پھپھو مرحومہ کے صاحبزادے۔“ ہما نے بتایا۔

”تو یہ یہاں ہے؟“

”یہیں رہتے ہیں۔ پڑھائی کے سلسلے میں گئے ہوئے ہیں کبھی کبھی ملنے آ جاتے ہیں، آؤ شربت بنائیں۔“ ہما لاپروائی سے چینی گھولنے میں لگ گئی۔

”میں نے تو آج پہلی دفعہ دیکھا ہے۔“

”ہاں ایک دو دفعہ آئے تھے، تم سو رہی تھیں۔ شام کو آئے، صبح روانہ، یہ چینی چکھو ذرا۔“

ہما سب سے زیادہ اہمیت کھانے پینے کو دیتی تھی۔ سب کے اعتراض پر ایک ہی جواب کہ انسان آیا ہی کھانے پینے کے لیے ہے ورنہ جنت میں کیا کمی تھی کہ آدم و حوا دنیا میں پھینکے گئے۔“

نہ جانے بن یامین میں کیا تھا، ثنا کو اس سے خوف آتا تھا وہ نانی کے پاس ان سے جڑ کر بیٹھا تھا۔ اور نانی کو اپنی جوان بیٹیاں یاد آئیں جو انہیں داغِ مفارقت دے چکی تھیں۔ ان کے حسن و جمال کے چرچے تو خاندان تک تھے ہی۔ ان کی بدنصیبی مثال بن گئی تھی۔ ثنا کو یقین تھا اس کی ماں کے حسن و جمال کی وجہ سے اس کے باپ نے ان سے شادی کی ہوگی۔ سب کہتے تھے۔ ثنا اپنی ماں کی شبیہہ ہے، مگر خود بانو تو سچ مچ حور تھی۔ نرم و نازک، لچکیلی شاخ کی مانند۔ چاند کو شرمانے والی رنگت اور گلاب کی پنکھڑی جیسی جلد۔ ثنا کا جی چاہتا لوگ اس کی ماں کا ذکر کرتے رہیں اور وہ سنتی رہے، مگر نانی فوراً موضوع بدل ڈالتیں۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی نواسی اداس ہو۔

یوں تو یہاں سب ہی اسے چاہتے تھے۔ بڑے ماموں جب بھی موقع ملتا، اس سے بطورِ خاص ملتے۔ اپنے پاس بٹھا کر اس کی ضروریات کے بارے میں دریافت کرتے۔ وہ بے حد مصروف رہتے تھے۔ اختر ان کا خوب ریکارڈ لگاتا۔ انہیں ”والدِ گم گشتہ“ ”گمشدہ ابا“ ”ہماری راہ کا مسافر“ اور نہ جانے کیا کیا کہتا۔

ممانی، جو نانی کی بھتیجی تھیں، بے حد خدمت گزار اور سب کا خیال رکھنے والی۔ جب صبا، ہما کے لیے کچھ لاتیں۔ ثنا کو نہ بھولتیں۔ ہاں جب صبا، ہما پر ڈانٹ پڑتی۔ تب بھی ثنا کو نہ بھولتیں۔ ویسے وہ گھر کے کاموں میں بے حد مصروف خاتون تھیں۔ اختر کہتا تھا۔

”ہماری امی ایسی خاتون ہیں جو اپنی واحد اولادِ نرینہ کو بھول جاتی ہیں کہ اسے کھانا ملا کہ نہیں۔ وہ آرام کر سکا یا نہیں۔ اس کے پاس لباس بھی ہیں یا نہیں۔ کبھی کبھی الماری کھول کر حیران ہوتا ہوں کہ عنایت میاں کا فرزند دلبند، بلکہ فرزند ارجمند اور اس کی الماری کپڑوں سے خالی۔“

”کمرے میں ہر طرف جو کھیت اُگے رہتے ہیں۔ ان پر نظر ڈال لیا کرو۔ وہ فرزند کے لباس ہی ہوتے ہیں۔“ والدہ فرماتیں۔

”تو ان کا سمیٹنا، دھونا، دھلوانا، کس کی ذمہ داری ہے۔“

”جس نے کھیت اگایا، وہی کاٹے۔“ ممانی صاف جواب دیتیں۔

اختر کراہتا ہوا اٹھتا۔ صبا کی چوٹی پکڑ کر آویزے

جاتا اور پھر چند دن بعد اسی قسم کے مکالمے۔ یوں تو صبا، اختر کے کام کرتی ہی تھی، مگر اسے کالج کی مصروفیات سے کم ہی وقت ملتا تھا اور گھر کے کاموں میں بھی وہ ماں کی مدد کرتی تھی۔ ہما صرف کھانے میں مدد کر سکتی تھی۔

کبھی کبھی ممانی، ماموں کو اکسا کر اختر کو جھاڑ پلانے کا پروگرام بنائیں جسے دادی ملیامیٹ کر دیتیں۔

”ارے اپنا زمانہ یاد کرو، جی بھر کے بے ڈھنگے تھے تم۔ کپڑے، جوتے، کتابیں جگہ جگہ سے چننے چننے میں گھس گئی۔ پلے میں ممتا کی ماری کمبخت، کوئی اور کام کرتی تو نام تو ہوتا۔“

نانی کو پچھتاوا تھا کہ جوانی میں گھر کی صفائی اور بچوں کو اعلا لباس میں دیکھنے کی کوشش میں انہوں نے اپنے ہاتھ تھکائے، ہڈیاں گھسیں، اپنا، اپنی صحت کا خیال نہ کیا۔

رانی آپا، بڑے ماموں کی بڑی بیٹی جب آتیں، گھر میں شور، ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ ان کے شوہر — نظام الدین جو جامی کہلاتے تھے بے حد دلچسپ ”ہلا گلا پسند کرنے والے — سسرال میں آ کر زیادہ ہی پھیل جاتے۔ اختر، ظفر، اطہر اور انور کے ساتھ کرکٹ کھیلتے اور خوب بے ایمانی کرتے۔ ان کی کارکردگی کو مدِنظر رکھتے ہوئے سب نے طے کیا کہ انہیں ایمپائر بنا دیا جائے، مگر اس میں بھی وہ کمال دکھاتے۔ پہلے سے شرط لگا دیتے کہ جیتنے والی ٹیم ان کو ٹریٹ دے گی اور جو زیادہ کھلانے کا وعدہ کرتا اس کو جتوا دیتے۔

مانہ اور رشنی جو یوں تو سب سے الگ تھلگ رہنا پسند کرتیں۔ رانی آپا کے آتے ہی بڑے ماموں کے پورشن میں آ جاتیں۔ اور جامی بھائی سے مذاق بھی کرتیں۔ ویسے وہ ثنا کو تو کسی قابل سمجھتی نہ تھیں بلکہ کسی کو بھی اپنے برابر نہیں سمجھتی تھیں۔

ان کے باپ کا عہدہ بڑا تھا۔ ماں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھیں۔ وہ دونوں خود بہت سے کورس کر چکی تھیں۔ آئے دن کسی نہ کسی کلب سے بلاوا آتا۔ کبھی مائنڈ ٹنگ کر رہی ہیں کبھی کادریس میں حصہ لے رہی ہیں۔ وہ اپنی مرضی کی مالک تھیں۔ ہیومنش کورس کر چکی تھیں۔ ان کی پینٹنگ ان کے اپنے خیال میں اعلا درجے کی ہوتی تھی۔ اب وہ ایک نمائش میں حصہ لینے کا ارادہ کر رہی تھیں۔

اور ان کے یہ قابلِ قدر کارنامے اختر کی ہنسی کا باعث بن رہے تھے۔ اختر ان مشاغل کا مذاق اڑاتا رہتا تھا اور جامی کو بھی شریک کرتا، مگر چونکہ رانی آپا نے مارے محبت کے ”خاندان بچاریے“ کے جذبے کے تحت نہایت جوش و خروش کے مظاہرے کے بعد مانہ اور اختر کی منگنی کروائی تھی تو انہوں نے اختر کو بھی طنز کرنے اور جامی کو اس کا ساتھ دینے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اب تو وہ خود ایسی باتیں کرتیں جیسے اختر اور مانہ کا زور و شور سے رومانس چل رہا ہو۔

حالانکہ اختر بغیر طنز کے مانہ سے مخاطب نہ ہوتا تھا۔

برآمدے میں بیٹھے ہوئے سب چلغوزے، مونگ پھلیاں کھا رہے تھے۔ اختر اور جامی میں مقابلہ ہو رہا تھا کھانے کا۔ رشنی، مانہ، صبا، ہما سب شریک تھیں۔

پاک و ہند میں یکساں مقبول شاعر
وسیم بریلوی
کا مجموعۂ کلام
مزاج
قیمت 60/ روپے
غزلیں اور گیت
شائع ہو گیا ہے
سول ایجنٹ
مکتبۂ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی

ہما اور ثنا میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوئی تھیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اگلے سال سائنس لیں یا آرٹس۔

اختر اور جامی بحث کر رہے تھے، رانی آپا بھی آکر پیچھے بیٹھ گئیں۔

سب اپنی اپنی رائے سے نواز رہے تھے۔

"میری مانو۔" اختر نے بات شروع کی ہی تھی کہ رانی آپا نے زور سے ایک دو تھڑ اس کی کمر پہ رسید کیا۔ اختر نے کراہ کر پیٹھ سہلاتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔

رانی آپا نے آنکھیں نکالیں غرّا کر کہا۔

"بے حیا! سب کے سامنے رومانس بگھارا جا رہا ہے میری مانو—" انہوں نے منہ بنا کر نقل آتاری۔

"اُف رانی آپا! آپ کی یہ عادت ابھی تک نہیں گئی۔ بغیر پوری بات سنے ہاتھ جڑنے کی۔ اوہ! میں تو ثنا سے کہہ رہا تھا کہ میری مانو تو آرٹس لینا۔ آسان ہے۔ کیا جلتا ہوا تھپڑ دیا ہے۔ ایمان سے بڑا بھاری ہاتھ ہے رانی آپا کا۔"

اختر، جامی سے فریاد کر رہا تھا۔

جامی نے رازدارانہ انداز میں رانی سے پوچھا۔

"پیر تو بھاری نہیں؟"

رانی آپا نے جلبلا کر ہاتھ اٹھایا، پھر ارادہ ملتوی کر کے بھنا کر بولیں۔

"بڑے بدتمیز ہو تم سب، شرم تو نہیں آتی۔ اس قدر— اس قدر بے ہودہ—"

"یہ آپ کے مجازی خدا؟" اختر نے سوال کیا۔

"یہ بھی یہاں آکر تم جیسے ہو جاتے ہیں۔ اصل میں تم لوگ اس قابل ہو ہی نہیں کہ تم سے کوئی معقول بات کی جائے اور جامی گھر میں ایسے بھیگے بلے بنے رہتے ہیں، جیسے کچھ جانتے نہیں۔ یہاں آکر جوہر کھلتے ہیں ان کے۔"

"جوہر تو ہیں تم نے پابندیاں لگا کر زنگ آلود کیا ہوا ہے۔ ایک یہی گھر تو ہے جہاں آزادی نصیب ہے۔"

جامی بھائی زنازن چلغوزے کھا رہے تھے۔ ایک منٹ کیا، ایک لمحہ بھی ہاتھ اور منہ نہیں رکے۔

"گھر چلو گے نا پھر دیکھنا۔" رانی آپا نے آنکھیں نکال کر دھمکی دی۔

جامی نے مٹھی بھر کشمش جیب میں ڈالی اور اختر سے کہا۔

"گھر چلو گے نا میرے ساتھ۔ یہ لفظ 'شکایت' تو محض ان کی کسرِ نفسی ہے، ورنہ تم جانتے ہو، ہاتھ بھاری ہے۔"

"اب چھوٹوں کے سامنے۔" رانی دانت پیس کر رہ گئیں۔

"ہوتا ناں میرا پیارا بھائی بن یامین۔ تم لوگوں کی مجال نہ تھی کہ مجھے جواب دیتے۔"

"اللہ— اللہ رحم— کس بلا کو کا نام لے لیا۔ نام نے ہی کام کر دکھایا۔" جامی مؤدب ہو کر بیٹھے اور جھومنے لگے، پھر بولے۔

"دراصل کسی پیر بزرگ کے نام کے ساتھ میرا خون گردش میں آجاتا ہے۔ تصوف میرا خاندانی وصف ہے۔" پھر دائیں بائیں جھومنا شروع کر دیا۔

"اور میں، مجھے بچپن سے کسی بھی ایسے بزرگ کے ذکر پر میں قلابازیاں اور چھلانگیں لگانا شروع کر دیتا ہوں۔"

اختر نے وہیں بیٹھے بیٹھے قلابازی کھائی۔ ثنی کے عین سامنے جا پہنچے۔ لڑکیوں نے چیخیں ماریں اور بھاگ کھڑی ہوئیں۔

"شکر ہے چلی گئیں۔ سارے چلغوزے کھائے لے رہی تھیں ویسے بھی سیزن آف ہے۔"

"میں کہتی ہوں کہ تم کبھی سنجیدہ ہو گے کہ نہیں۔" رانی نے کشن دے مارا۔

"نہیں۔" اختر سنجیدگی سے گردن ہلا کر بولے۔

"جب تک آپ کے وہ پیرِ طریقت نہ آجائیں، سنجیدہ ہونا ممکن نہیں۔"

"اختر! میں کہتی ہوں، یوں گھر میں لڑکیوں کے ساتھ ہلا گلا کرنے کے بجائے تم کو ابا کی مدد کرنی چاہیے۔ وہ کس قدر مصروف رہتے ہیں۔ صحت دیکھی ہے ان کی—!"

"صحت کا راز کام میں مضمر ہے۔ رانی آپا— کام، کام اور کام— یہ ہمارے قائد کا مقولہ ہے، اور نہایت ترغیب آمیز۔"

"کاش! تم کو بھی ترغیب ہوئی ہوتی۔ مگر تم کام کے بجائے اودھم بازی میں ملوث رہتے ہو۔"

"شکر کریں کسی جرم میں ملوث نہیں نا۔ اب دیکھیں جامی بھائی، ہمارے ملک کا کیا حال ہے، جس کو دیکھو راشی، مرتشی، تجارت میں کھلم کھلا بے ایمانی— سرکاری، غیر سرکاری اہلکار صرف کھانے، پینے چلانے اور سمیٹنے میں مصروف، کوئی ادارہ جھوٹ فریب سے خالی نہیں، ایمان دار نہیں۔ بس یہ وجہ ہے کہ میں گھر بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اپنا ضمیر صاف رکھتا ہوں۔ ایمان سلامت، کسی جرم میں ملوث نہیں۔"

"اور باپ کی محنت گھر بیٹھے کھا اور اڑا رہا ہوں۔" رانی نے چڑ کر کہا۔

"یہ ہاتھ پیر ہلائے بغیر پیٹ بھرنا جرم نہیں تو کیا ہے، کچھ کام کرو، حق حلال کی کماؤ، بوڑھے باپ کو آرام پہنچاؤ۔"

"الحمد للہ باپ کی حلال کی کمائی ہے اور انہیں آرام کرنے سے کون روکتا ہے، گھر بیٹھیں، عیش کریں۔"

"پھر فیکٹری کون چلائے؟"

"وہ چل رہی ہے، چلے گی۔ بھئی مشین ہے، بٹن دبایا چل پڑی۔"

"اور بٹن کون دبائے گا فرشتے؟"

"اچھا تو ابا بٹن دبانے جاتے ہیں۔ یہ آج معلوم ہوا۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق اس کام کے لیے وہاں ملازمین ہیں۔ ویسے آرام کرنے کا ابا کو شوق ہی نہیں، ہم سے سیکھ لیں۔ آرام— آرام— اور بس آرام۔"

"اختر! بہت ڈھیٹ ہو تم۔ امی، ابا تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں اور تم نکمے پن کے —— ریکارڈ توڑ رہے ہو۔"

"ایں! کب ہو رہی ہے یہ مبارک تقریب؟" مارے شوق کے اختر اٹھ کر بیٹھ گئے۔

رانی نے خفگی سے منہ موڑ لیا۔

"رانی آپا! بتائیے کب میرے سہرے کے پھول کھلیں گے، کب میں گھوڑے پہ چڑھوں گا اور آپ گائیں گی۔ دیر میرا کوڑی چڑھیا— کوڑی چڑھیا نی سیو کوڑی چڑھیا۔"

اختر کے ساتھ جامی نے بھی تالیاں بجا بجا کر سُر میں سُر ملایا۔

قوالی شروع ہو گئی۔ لڑکیوں نے اندر جھانکا، ماحول سازگار، بلکہ خوش آئند پایا۔ وہ سب بھرّا مار کر گھس آئیں اور ان کے ساتھ ہی گانا شروع کر دیا۔ ویلیاں دا راجہ میرے بابل دا پیارا— امڑی دے دل دا سہارا— اب مردانی اور زنانی آوازیں ایک سُر میں شامل تھیں۔ ثنا کھڑی ہوئی انہیں دیکھ رہی تھی۔

رانی نے اسے بلا کر بٹھا لیا۔

"میری پیاری سی بہن تو سب سے اچھی ہے۔ ان بیہودگیوں میں شریک نہیں ہوتی اور کبھی نہ سیکھنا یہ ساری بیہودگیاں۔ اور اے ماڈرن اے مانو! تم تو چپ ہو جاؤ۔ یہ گانا تمہاری شادی کا گایا جا رہا ہے ثنا۔"

مانو منہ پر ہاتھ رکھ کر الگ ہو گئی۔ اختر نے چیخ کر کہا۔

"گاؤ مانو گاؤ— یہ میں اپنے لیے، واحد اپنے لیے گا رہا ہوں۔"

رانی کو غصہ آیا۔ انہوں نے پھر اختر کی پیٹھ پہ دو تھڑ رسید کیا۔

اختر نے کراہ کر فوراً دھن بدل ڈالی، گیت بدل ڈالا اور سب اسی طرح اس کا ساتھ دیتے رہے۔

خلافِ توقع ثنا کا رزلٹ بہت اچھا آیا۔ ہما اور ثنا اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تھیں۔ ثنا نے بھی سائنس میں داخلہ لے لیا۔ گوکہ اختر کی خواہش تھی، ثنا آرٹس لے۔ اس کے خیال میں ثنا آرٹس میں زیادہ ترقی کر سکتی تھی، مگر اختر کے دادا کا خیال تھا کہ اختر کیا جانے سائنس کیا ہے، اسے آرٹس کا بھی علم نہیں۔ وہ ایسا گدھا ہے، جس پر کتابیں لادنا علم کی توہین ہے۔

اختر کو بہت غصہ آیا، مگر دادا سے بحث کرنا لاحاصل تھا۔

مانو اب ایم اے کرنا چاہتی تھی۔ ہما کے سامنے بات ہوئی، مگر اس کی امی نے کہا۔

"اب بس کرو، تمہاری دادی کا کہنا ہے کہ روزانہ باہر جانے آنے سے رنگ جھلس گیا ہے۔ اب گھر بیٹھ کر ابٹن لگا کر رنگت نکھارو۔"

مانہ کو ابکائی آ گئی۔ ابٹن، مہندی، یہ گیلی گیلی چیزیں جن کی صورتیں ہی گھناؤنی ہوتی ہیں۔ مانہ کی نفاست سے لگا نہیں کھاتی تھیں۔

"اور ویسے بھی میں نے تمہاری دادی سے کہہ دیا ہے کہ وہ بڑے بھیا کو یاد دلائیں کہ مانہ تعلیم سے فارغ ہو گئی ہے۔ اختر کو کام سے لگائیں تاکہ میں بھی بے فکر ہو جاؤں۔"

مانہ نے بہت برا مانا اور بولی۔

"میں تو ایم اے کے بعد پی ایچ ڈی بھی کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ اختر میں سنجیدگی نہیں ہے۔ احساسِ ذمہ داری نہیں۔ کبھی برا وقت آیا تو میں اپنی تعلیم اور قابلیت کے بل پر معقول جاب حاصل کر سکوں گی۔ آپ لوگوں کو شادی کی کیا جلدی ہے میں بوڑھی نہیں ہو رہی۔ مجھے مستقبل بنانا ہے۔"

ہما نے صبا کو لفظ بہ لفظ گفتگو سنا دی۔ صبا کو بہت رنج ہوا۔ اب اختر بھائی اتنے بھی غیر ذمہ دار نہیں کہ بیوی سے جاب کروائیں۔ مگر اختر پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ہنس پڑا تھا اور چپکے سے کہا۔

"ارے اچھا ہے، ایم اے، پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے دو اسے۔ دو فائدے ہوں گے۔ یا تو اعلا تعلیم یافتہ بیوی میری ساری ذمے داری سنبھالے گی، ہم گھر میں بیٹھے عیش کریں گے یا پھر ان کی طول طویل تعلیم کے دوران امی کا پیمانہ صبر لبریز ہو جائے گا اور وہ مجھے اپنی آرزو کے مطابق کسی خوبصورت کھونٹے سے باندھ دیں گی اور جب بی بی مانہ اعلاترین ڈگریاں لے کر گھر لوٹیں گی تو ان کے اس مستقبل کی بساط لپیٹی جا چکی ہو گی، پھر وہ کسی ادھیڑ عمر گنجے افسر کے انتظار میں دل کا دیا جلائے بیٹھی ہوں گی اور ان کے بالوں میں چاندی بھر رہی ہو گی۔"

"فضول باتیں مت کریں۔"

"سچ کہتا ہوں بے وقوف لڑکیو! دونوں طرح فائدہ ہے۔ یا تو تمہیں، تمہاری عمر کی حسین چاند جیسی بھابی مل جائے گی یا پھر کماؤ افسرانہ شان والی۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"مجھے افسر بیگم نہیں چاہییں۔"

"آپ کو مانہ سے محبت نہیں؟"

"ہم شادی کے بعد کی محبت کے قائل ہیں۔ اپنے ابا کی طرح، شریف۔"

"مگر ہمیں مانہ چاہیے۔" ہما نے سختی سے کہا۔ وہ اختر کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

"بڑے مضبوط ارادے ہیں بھئی۔ مدعی سست، گواہ چست۔"

یہ گفتگو نہ جانے شنی نے کس طرح سن لی اور مانہ سے کن الفاظ میں بیان کی، مگر مانہ پر اس کا اثر نہیں ہوا۔ وہ دندناتی آئی اور اختر سے مخاطب ہو کر بولی۔

"میں ایم اے ضرور کروں گی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کروں گی۔ اس سے آگے بھی جتنا کچھ پڑھ سکتی ہوں، پڑھوں گی، تم انتظار نہیں کر سکتے تو الوداع، میرے شوق کے آگے رکاوٹ کھڑی کرنے والوں کو میں برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بات دادا، دادی سے بھی کہہ دینا۔"

اختر نے آنکھیں نچائیں۔ سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر ہما، صبا کو دیکھا۔ مانہ بھنا کر پیر پٹختی چلی گئی۔ وہ اختر کے جواب کے انتظار میں کھڑی تھی، مگر جواب ملا نہیں۔ اختر نے نکتے پن کو رانی آپا نے زیادہ اچھالا، اور شادی کا معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

اختر نے رانی آپا سے کہا کہ مانہ اس پر رعب جما گئی ہے۔ اسے اپنے ان کورسز پر ناز ہے، جن پر اس نے خاصی رقوم خرچ کی ہیں اور اپنے باپ کے عہدے کا بھی غرور ہے۔ وہ مجھے غلاموں کی صف میں دیکھنا پسند کرے گی۔

رانی آپا نے مانہ کی خبر لی، جس کا اس نے برا مانا اور منہ پھلا کر بیٹھی رہی، مگر اس نے ایم اے میں داخلہ لے لیا، کیونکہ یہ اس کی ضد اور انا کا سوال تھا۔ دادی بھی اس کی ضد کے سامنے مجبور تھیں۔

کبھی کبھی صبا اور ہما کے ساتھ ثنا بھی خالہ کے گھر چلی جاتی۔ خالہ امی اسے دیکھ کر نہال ہو جاتیں۔ ان کی کوئی بیٹی نہ تھی، چار بیٹے تھے۔ تین شادی کر کے امریکا، کینیڈا چلے گئے۔ اب چھوٹا اکرم تھا اور گھر میں

نوکروں کی فوج ظفر موج۔ گھر بھی پورا محل تھا اور اس قدر عالی شان، قیمتی ساز و سامان سے بھرا ہوا کہ جیسے نگار خانہ ہو۔ ہر سمت خوبصورت تصویریں، آئینے، بلوری گلدان اور غیر ممالک سے لی گئی آرائشی اشیا، وہ گھر سے زیادہ فلمی سیٹ لگا کرتا تھا۔ ثنا تھوڑی دیر میں گھبرا جاتی اور گھر واپسی کی جلدی کرتی۔ ہما، صبا کا دل تو وہاں خوب لگتا۔ مزے سے نت نئے گانے ڈیک پر سنتیں۔ اکرم سے مذاق بھی کرتیں۔ اکرم کو فلموں، گانوں، اداکاروں کے ذکر میں لطف ملتا تھا۔ بڑی وسیع معلومات تھیں اس کی، مگر کوئی لڑکی نہ ہونے کی وجہ سے ثنا تو بہت گھبراتی تھی۔

پھپھو کو لڑکی کی بہت تمنا تھی۔ بہوئیں تو چند مہینے رہ کر چلی گئیں۔

"سنا ہے میرے بچپن میں پھپھو نے امی سے مجھے مانگا تھا۔ ابا نے انکار کر دیا۔ پھر تم لندن سے آئیں تو پھپھو نے دادی سے کہا۔ اسے مجھے دے دیں، مگر دادی نے کہا، اب بڑی ہو جائے تو بہو بنا کر لے جانا۔" ہما، ثنا کو یہ قصہ بتا کر ہنسی۔

"اب پھپھو پھر دادی کے پیچھے پڑی ہیں کہ ثنا میری ہے، اکرم کو بھی پسند ہے۔"

"کیا۔۔۔ فضول باتیں مت کرو۔ اور وہاں خالہ کے ہاں تو میں قیامت تک ایڈجسٹ ہی نہیں ہو سکتی۔ اس گھر کے سامان اور ہر کمرے کی چیزیں گن گن کر میں تھک چکی ہوں اور یقین کرو آج تک گنتی مکمل نہیں ہو سکی۔"

"شادی کے بعد ہو جائے گی، دن رات یہی کام کرنا۔۔۔"

"نہیں ہما! ایسے گھر کا تو تصور بھی نہیں کر سکتی میں اور پھر۔۔۔ ابھی تو پڑھنا ہے، کچھ کرنا ہے۔"

"شادی کر لو بس۔"

"کیوں، مانہ ایم اے کرے پی۔ ایچ۔ ڈی۔۔۔ اور پتا نہیں کیا، میں بی ایس سی بھی نہ کروں۔"

"مانہ کا مقابلہ نہ کرو، وہ بڑی چیز ہیں۔ ان کے ماں باپ اعلا ہیں اور ننھیال اعلاترین جس کا ذکر وہ بڑے فخر سے کرتی ہیں۔ ایک ماموں وزیر، دوسرے سفیر۔ خالو سیکرٹری، پتا نہیں کیا کیا، اور مگر ایک کمی ہے۔ کسی کا لڑکا ہی نہیں۔ ایک ہے تو وہ چھوٹا ہے۔"

"میں بھی اپنے ننھیال پر فخر کرتی ہوں۔ میرے سب ماموں محبت، شفقت، حسن سلوک میں لاثانی ہیں۔"

"شنی آپا کہتی ہیں اگر کسی ماموں کا بیٹا ان کے لائق ہوتا تو وہ اختر بھائی کی پروا تک نہ کرتیں۔ ہائے اللہ گنجے کو ناخن نہیں دیتا، ورنہ وہ کھجا کھجا کر زخمی ہو جاتا۔"

"میں نے تو کئی گنجے دیکھے ہیں جن کے ناخن بھی ہیں اور وہ کھجاتے بھی نہیں۔" ثنا ہنس کر بولی۔

"وہ تمہارے رشتے دار ہوں گے۔ نیک شریف اور صابر۔"

صابر تو وہ تھی، نیک بھی تھی، مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ وہ دنیا میں آئی کیوں ہے۔ ماں باپ اور اپنے گھر کا تصور تو کر سکتی تھی، مگر اسے کچھ ملا نہیں۔ ماں باپ کا تحفظ، نہ گھر کی پناہ، بچپن، ادھر سے ادھر آتے جاتے گزر گیا۔ نانی کے پاس آئی تو گو کہ ٹک کر رہنا نصیب ہوا، مگر اسے بہت جلد احساس ہو گیا کہ یہ اس کا گھر نہیں۔

اختر، مانہ، شنی کا ہے، ہما، صبا کا ہے، ظفر لوگوں کا ہے۔ ان سب کے حقوق تھے اس گھر پر، اس کا حق نہ تھا۔ وہ سب مالکانہ حقوق سے رہتے تھے۔ ثنا مجبوری سے۔

گو کہ بن یامین کا رشتہ بھی اسی قسم کا تھا، مگر وہ بھی تو بڑے رعب کے ساتھ رہتا تھا۔ جب وہ گھر میں نہ ہوتا، تب بھی اس کے نام کا کمرا مقفل رہتا۔ اگر مہمان آتے تو اختر ان کے لیے اپنا کمرا خالی کر دیتا۔ بن یامین کے کمرے کو کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نانی کا لاڈلا، کڑوا کسیلا، کٹ کھنا بلا۔ ثنا سے تو اسے کوئی خاص عناد تھا۔ جب دیکھتا گھور کر آنکھیں سرخ کر کے۔ بات تو اس نے کبھی کی نہیں تھی۔

یوں بھی وہ لڑکیوں سے خاصا دور دور رہتا۔ بس نانی سے اس کی لاثانی محبت کے سین چلا کرتے۔ ثنا چڑ جاتی۔ نانی نے کبھی بھی ثنا کو اس قابل نہ سمجھا کہ

اسے ساتھ بٹھا کر یا اپنے پاس لٹا کر پیار بھری باتیں کرتیں۔ وہ بھی تو ان کی مرحومہ بیٹی کی اولاد تھی — بن یامین سے زیادہ حق تھا اس کا، مگر یہ اُس کی اپنی سوچ تھی۔

ایک روز بڑی حمانی نے صبا اور ہما کے ساتھ اسے بھی صفائی میں لگا دیا۔ ثنا کو اوپر کے کمرے کی صفائی کرنی تھی۔ اختر کا کمرا بے حد صفائی طلب تھا۔ ہر سمت کپڑوں کے ڈھیر، نہ میلے کا پتا چلتا تھا نہ اُجلے کا۔ صبا کہتی تھی اختر بھائی کے کمرے میں کیڑے آ گئے ہیں، کتابیں چلتی پھرتی ہیں۔ گھنٹہ بھر لگ گیا چیزیں اٹھاتے اٹھاتے۔ کمرے سے نکلی تو بن یامین کا کمرا ابھی کھول لیا۔ چلو کیا یاد کریں گے حضرت، مگر حضرت کا کمرا تو یوں سجا بنا صاف ستھرا تھا، جیسے ابھی کوئی صاف کر کے گیا ہو۔ کہیں ذرا سی گرد دیمک نہ تھی۔ پھر بھی آئی تھی تو کچھ کارروائی ڈالنی تھی۔ تصویر کا رُخ بدل دیا، کتابوں کی ترتیب بدلی۔ ٹیبل لیمپ کو نیچے سے اٹھا کر ٹیبل پر رکھ دیا اور کمرا جس طرح بند تھا، اسی طرح بند کر کے نیچے آ گئی۔ صبا نے کہا۔

"مزا آیا ہوگا اختر بھائی کا کمرا صاف کر کے۔ آج میری جان بچ گئی۔ آف! اس قدر گندا، گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔"

"اور دوسرا کمرا، ایسا صاف، جیسے فرشتے صاف کر کے گئے ہوں۔"

صبا کا منہ کھلا، پھر بند ہوا، پھر اُس نے کہا۔

"تم دوسرے کمرے میں کیوں گئیں؟ وہ تو بند ہی رہتا ہے۔"

"بند دروازے کھولنے میں مجھے تو بہت لطف آتا ہے۔" ثنا نے کہا۔

بن یامین کئی دن سے غائب تھا۔ رات اچانک آ گیا۔ نانی سے لاڈ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں گیا پھر فوراً واپس آیا۔

"میرے کمرے میں کس نے تہلکہ مچایا ہے؟" وہ بھاری اور ڈرا دینے والی آواز میں بڑے رعب سے بولا۔ اُس کی سرخ آنکھیں ثنا کی جانب آگ برسا رہی تھیں۔

"وہ — میں دراصل غلطی سے اختر بھائی —" صبا لڑکھڑاتی زبان میں اوٹ پٹانگ بولنے لگی۔

"سب کو بتا دیں۔ میں اپنے کمرے میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ کسی کی محتاجی گوارا نہیں ہے۔ میں اپنا کام خود کرنے کا عادی ہوں۔" اتنا کہہ کر دھڑ دھڑ سیڑھیاں چڑھ گیا۔

"یہ بن یامین بھائی بہت شکی بھی ہیں اور سڑے مزاج کے بھی۔ ان کے کمرے میں کیا ہیرے جواہرات رکھے ہیں، جو کوئی چرا لے گا۔" ہما خفا ہو گئی۔

"نہیں، نہیں کچھ نہیں ہے۔" ثنا نے گھبرا کر کہا۔

"پکڑ لیا چور، تم گئی تھیں اور صبا نے الزام اپنے سر لے لیا۔" ہما شرارت سے آنکھیں چمکا رہی تھی۔

"میں نے اس لیے کہا کہ بے چاری ثنا کی شامت نہ آ جائے۔"

"ہوں — ہوں، مجھے سب خبر ہے۔" ہما سر ہلانے لگی۔

"قربانی، ایثار، خدمت خلق، یہ تو تمہاری گھٹی میں شامل کر کے چھوٹی پھپھو نے پلا دیا تھا۔"

"میری امی نے؟" ثنا نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بھئی، چھوٹی پھپھو اور امی میں بڑا پیار تھا۔ ابا ان دنوں سروس کر رہے تھے اور کوئٹہ میں ان کی پوسٹنگ تھی۔ صبا ہونے والی تھی تو چھوٹی پھپھو کوئٹہ گئیں۔ پھر ان کا وہیں دل لگ گیا۔ آئیں بھی تو امی اور صبا کے ساتھ۔ جناب اتنا پیار کرتی تھیں صبا سے کہ حد نہیں۔"

ثنا کو اپنی امی کے قصے سننے میں بہت لطف ملتا تھا۔ کبھی کبھار نانی ذکر کرتیں، مگر اسی دوران ناناجی سے ان کا کسی بات پر اختلاف ہو جاتا، بحث چل پڑتی اور ثنا وہیں سے بھاگ آتی۔

"ہما! یہ مانا اور شکی — ان سے امی کو پیار نہ تھا —؟"

"ہوگا، مگر امی اوّل تو کزن پھر ویسے بھی چھوٹی پھپھو سے جو کوئی ذرا پیار سے محبت سے پیش آتا وہ فوراً اُس کی مرید ہو جاتیں۔ سنا ہے انہیں سخت

لہجے یا اونچی آواز کی تو برداشت ہی نہیں تھی۔ رونے لگ جاتی تھیں، جب دادا، دادی میں بحث ہوتی۔"

"اچھا! تو نانی شروع سے ہی —!"

"ہاں شروع سے ہی حاوی تھیں دادا پر۔ سنا ہے اوّل دن سے گھر کے معاملات میں دخیل تھیں اپنی ساس کے زمانے سے ہی، مگر لوگ کہتے ہیں کہ دادی نے اپنے بچوں کی تربیت بھی خود کی۔ اتنی اچھی تربیت کہ لوگ اب بھی تعریف کرتے ہیں۔ اگر وہ سختی نہ کرتیں تو بچوں کے بگڑنے میں بھلا دیر تھی —؟"

صبا اور ثنا کو ہنسی آ گئی۔

"ہاں دادی کا خیال ہے کہ ہم تو بگڑی ہوئی اولاد ہیں۔" صبا بولی۔

"خیر، سب تو نہیں، مگر میں — مجھ سے خفا ہیں دادی۔ اصل میں ساری محبت تو رانی آپا — سب سے بڑی تھیں — اختر بھائی پہلی اولاد نرینہ، صبا چھوٹی پھپھو کی لاڈلی، ان کو سب کچھ مل گیا۔ میرے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔ ہائے میری بے قدری، بے چاری میں —" ہما نے سرد آہ بھری۔

"تم اپنی قدر خود گرا لیتی ہو۔" ثنا نے کہا۔

"ہاں کیا کروں پھر، وہ تو آپ کے دل میں تھوڑی سی میرے لیے محبت پیدا ہو گئی تو زندہ ہوں۔"

"مگر ابا تو تم کو اب بھول چکے ہیں۔"

"واقعی، مگر چونکہ میں بڑی ہو چکی ہوں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"کھانے پینے سے تو خاصا فرق پڑتا ہے۔" ثنا مسکرائی۔

"بے شک، اسی لیے تو زندہ ہوں۔" اُس نے جھٹ تکیے کے نیچے سے سیب نکال کر کھانا شروع کر دیا۔

"تم کھاؤ گی؟ ایک اور ہے۔"

"شکریہ۔" صبا اور ثنا نے منہ بنایا۔

"پرسوں تمہارے تکیے کے نیچے چیونٹیوں کی بارات تھی۔"

"ہاں، رات بھر کمبختوں نے کاٹ کاٹ کر میرا حشر کر دیا۔ میں کیلا رکھ کر بھول گئی تھی۔"

"ہما! تم کسی دن اس کھانے پینے کے چکر میں نقصان اُٹھاؤ گی۔"

اختر کی بے کاری سب سے زیادہ اس کے دادا کو بے قرار رکھتی تھی۔ ایک بار پھر اختر کا ذکر گھر میں نکتہ چینی کی زد میں تھا۔ دادا معترض، دادی وکیل صفائی۔

"ابھی چھبیس سال کا ہے۔ اپنا زمانہ یاد کرو۔ تیس برس کی عمر میں نوکری کی تھی تم نے۔"

"چھبیس سال کی عمر میں اختر کے باپ کا باپ بن چکا تھا میں۔" دادا غرائے۔

"ہاں یہ تو سچی بات ہے۔ شادی تو تمہاری اماں نے میرے سیدھے سادے ابا کو شیشے میں اتار کر طے کر لی اور جھٹ پٹ بیاہ کر مجھے اپنے گھر لے گئیں۔ کوئی انتظام تھا نہیں۔ بہو لانے کی جلدی پڑ گئی، بیٹھنے تک کو معقول جگہ نہ تھی۔ بستر نہ تھا۔ ایک پلنگ تھا سموسے کی شکل کا، جو مجھے اعزازی طور پر دیا گیا۔ بے خبری میں اس پر بیٹھی تو غڑاپ سے یوں گری جیسے قبر میں اتار دیا گیا ہو۔ بہتیرا ہاتھ پیر مار رہی ہوں، مگر ایسا جھلنگا پلنگ ہمارے گھر میں تو نوکر کا بھی نہیں ہوتا۔ میں اٹھنے کی کوشش کر رہی ہوں، مگر لگتا تھا جیسے اس نے نگل لیا ہو، مگرمچھ کسی سالم آدمی کو اسی طرح کھاتا ہے اور تم — کھڑے ہنس رہے تھے، بڑی قدر ہوئی میری، واہ!" دادی جھرجھری لے رہی تھیں۔

"اگر میرے گھر میں کچھ نہ تھا تو دے دیا ہوتا تمہارے باوا نے ڈبل بیڈ اور صوفہ سیٹ — میں کوئی اجنبی غیر تو نہ تھا، سب دیکھا بھالا تھا ان کا۔"

"لو اور سنو۔"

"سنو، سناؤ، تمہیں بھی ڈھنگ کا بر مل نہیں رہا تھا تبھی —!"

"کیا — کیا کہا؟ لو اب بڑھاپے میں جہیز نہ لانے کا طعنہ بھی سننا تھا اور بدنصیب نہ ہونے کی اطلاع بھی تم سے ملے گی۔ عنایت، صداقت — ارے شرافت۔"

"شرافت لندن میں ہے، سن رہا ہوگا تو آ جائے گا۔"

"ارے کیا ہے چھوٹے کا نام — بتاؤ۔" دادی

کی یادداشت کمزور تھی۔

"وجاہت۔" دادا نے لقمہ دیا۔

"ہاں وجاہت، سب لوگ آؤ، اب میں یہاں نہیں رہوں گی، چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں، کیا تماشا بنواؤ گی اپنا، کہاں جا رہی ہو؟" دادا فکرمند ہو گئے۔

دادی الماری سے کپڑے نکال کر گٹھڑی بنا رہی تھیں۔

"کرائے کے مکانوں کی کمی تو نہیں، چلے جائیں گے رہ لیں گے۔ صداقت لے دلہن ۔۔۔"

"کیا بہو کے سامنے مذاق اڑواؤ گی، کچھ اپنے اور میرے بڑھاپے کا ہی خیال کر لو، کبھی تو عقل سے کام لے لیا کرو۔"

"عقل نہیں تھی، تبھی اتنے دن تمہارے ساتھ گزارا کر لیا، بس اب مذاق ختم، سب کو لے جاؤں گی اپنے ساتھ، رہنا تم اکیلے۔" دادی نے سختی سے گٹھڑی میں گرہ باندھی۔

"سب کو کیوں ساتھ لے جاؤ گی۔ کیا ساتھ لائی تھیں؟" دادا کو دور کی سوجھی۔

"ٹھیک ہے بھئی، چار بیٹوں، تین بیٹیوں کا باپ بنوا دیا، عیش کر رہے ہو، اب مجھے بڑھاپے میں گھر سے نکالو گے۔ اکیلی تو میں قبر میں ہی جاؤں گی۔" دادی اب آبدیدہ ہو گئیں۔

صبا اور ثنا نے اختر کو دھکے دے کر دادی کے کمرے میں بھیجا تاکہ وہ ان کا غصہ ٹھنڈا کریں۔ ان ہی کی وجہ سے تو یہ جھگڑا ہوا تھا۔

اختر نے حیرت کی اداکاری کی۔

"ہیں، دادی یہ کیا، کہاں جا رہی ہیں؟"

"ارے کہاں جاؤں، میکہ بھی تو اجڑ گیا میرا، ایک بھائی تھا، وہ گزر گیا، بھتیجے امریکا جا بسے۔ ارے قہر ٹوٹے اس امریکا پر، برباد ہو منحوس، دنیا کے نقشے سے ناپید ہو جائے، جسے دیکھو امریکا کی سوجھ رہی ہے اور وہ مردود نگلے جا رہا ہے، تباہ کر دے الٰہی اس امریکا کو۔ نہ یہ ہو گا ۔۔۔!"

"نہ بھتیجے۔"

"ہیں، کیا بکواس کی تم نے؟"

"میرا مطلب ہے نہ امریکا ہو گا نہ بھتیجے جائیں گے۔ کیا آپ امریکا جا رہی ہیں گٹھڑی سمیت؟"

"بس بیٹا، اب کوئی سکھ نہیں زندگی میں، کہیں بھی جاؤں گی۔"

"دادی! آپ اس عمر میں کہاں جائیں گی، آپ کی برکت سے تو ہم بھی عیش کر رہے ہیں۔"

دادی نے لاڈلے پوتے کے مضبوط سہارے پر انحصار کر کے جانا ملتوی کر دیا۔

دادا نے بھی سکھ کا سانس لیا۔

صبا اور ثنا نے گٹھڑی کھول کر الماری میں کپڑے جما دیے۔

ثنا نے نرمی سے اپنی نانی کے بازو چھوئے۔ "نانی! آپ نانا جی کی بات کا برا نہ مانا کریں۔"

نانی نے غصے سے نواسی کو دیکھا۔

"چل ہٹ نانا کی چمچی، خبردار جو مجھ سے بات کی۔"

صبا بھی حیران ہو گئی، مگر ثنا پر تو جیسے بجلی سی گری۔ نانی یوں تو اس پر چنداں مہربان نہ تھیں، مگر اتنے سخت لہجے میں کبھی نہیں بولی تھیں۔ لہجے کے علاوہ ان کے الفاظ بھی ہتک آمیز تھے اور ان کی آنکھوں میں ثنا کے لیے غصے کی چنگاریاں چمک رہی تھیں۔

"دادی تو سب کو ایسی نظروں سے ہی گھورا کرتی ہیں۔ غصہ تازہ تھا، اس لیے تم پر اتار دیا۔" صبا نے ثنا اور روتے دیکھ کر سمجھایا۔

"اختر بھائی پر کیوں نہیں اتارا۔ لگتا ہے میں ہی قصوروار ہوں۔"

"ارے، وہ ہما کو کس بری طرح ڈانٹتی ہیں۔ ایک دو دفعہ تو مارا بھی تھا اسے۔"

"ہاں، مگر ان کی آنکھوں میں نفرت نہیں ہوتی۔"

"ثنا! دادی کسی سے نفرت نہیں کرتیں۔" صبا کی وکالت پر ثنا کو غصہ آ گیا۔

"کرتی ہیں ۔۔۔ کرتی ہیں، تم سے نہیں، مجھ سے۔ مجھ سے نفرت ہے انہیں، شدید نفرت۔ میں ان کی آنکھوں میں نفرت دیکھ چکی ہوں۔"

بات ختم کر کے اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ جہاں بن یامین کھڑا اسے گھور رہا تھا اور اس کی آنکھیں بھی شعلوں میں نہائی ہوئی تھیں۔

"تم ۔۔۔" وہ غرایا۔

"نفرت سے زیادہ قابل نفرت ہو۔ اس انتہائی نفرت کے لیے کوئی لفظ بھی ایجاد نہیں ہوا۔ قاتل، اس قاتل ہو تم، خالہ کی قاتل۔"

"کیا کہہ رہے ہو بن یامین بھائی؟" ہما چیخی۔

"وہی جو سچ ہے، اور یہ میرے دل کی آواز ہے۔"

"جائیں ۔۔۔ جائیں آپ، ہمیں آپ کے سچ اور دل کی آواز سے کوئی دلچسپی نہیں اور آئندہ ہمارے کمرے میں آنے کی زحمت نہ کریں، جائیے۔" ہما زور سے چیخی۔

صبا، ہما کو روک رہی تھی، مگر وہ بولنے پر آمادہ کر چلا رہی تھی۔

"اور ثنا سے قطعاً بات نہ کریں آپ۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں۔ ناقابل برداشت لوگوں سے بات کرنے کا۔ میری نانی کے متعلق کوئی بکواس کی، تو بولنا کیسا مار ڈالوں گا۔"

ہما غصے میں بلبلا اٹھی اور عجب نہ تھا کہ وہ اسے دھکے دے کر نکالتی، مگر بن یامین خود ہی دھم دھم کرتا چلا گیا۔

ہما کو رونا آ گیا اور ثنا دم بخود اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہ گئی۔

صبا، ہما کو سمجھا رہی تھی، ٹھنڈا کر رہی تھی، مگر ثنا، اسے نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا، نہ وہ کچھ سنتی تھی، اس کی سماعت میں بن یامین کا شعلوں میں لپٹا لہجہ اور آواز دہک رہی تھی۔ بن یامین کس بات پر اتنا آگ بگولہ ہوا۔ سچ ہے، کیا سچ ہے، وہ کس کی قاتل ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو سب بھولے کیوں چاہتیں لٹاتے ہیں، کیا وہ جھوٹے ہیں، مجرم کیا ہے میرا۔۔۔"

"کچھ نہیں ثنا، تم زیادہ پریشان نہ ہو، بن یامین اس سے بھی زیادہ غصہ کر سکتے ہیں۔"

صبا اور ہما نے اسے نارمل طریقے پر ٹھنڈا کر لیا، مگر اس دن کے بعد بن یامین کا رویہ اس کے ساتھ خاصا جارحانہ ہو گیا۔ گھورتا تو پہلے بھی تھا، اب تو بڑبڑانے لگا تھا۔ منہ ہی منہ میں جانے کیا کہتا تھا۔ ثنا اس سے ڈرنے لگی۔ وحشی لگتا تھا بالکل، یوں بھی کبھی کسی ماموں کی طرف نہیں جاتا تھا، نہ ہی کسی سے بات کرتا۔ بس نانی، نانا، صبا اور کبھی کبھی اختر سے مخاطب ہوتا۔ اپنا ہر کام خود کر لیتا۔ اس نے کبھی کسی سے چائے کی فرمائش نہیں کی، کسی سے کھانا نہیں مانگا، خود ہی کچن میں گھس کر پلیٹ بھر لیتا تھا۔

صبا کی کلاس فیلو کی بڑی بہن کی شادی تھی۔ یہ بڑی بہن شنی کی عزیز دوست تھی۔ اختر نے انہیں لے جانے سے معذوری کا اعلان کر دیا۔ شنی نے بن یامین سے نہ جانے کس طرح کہا تھا کہ وہ رضامند ہو گیا۔ مقررہ وقت پر اس نے گیٹ سے ہارن دینے شروع کیے۔ سب ایک دوسری کو آوازیں دیتی بھاگیں۔ شنی اور ریحانہ آگے بیٹھ گئیں، پیچھے صبا اور ہما ابھی بیٹھی تھیں اور ثنا اندر گھسنے کے لیے منتظر تھی کہ بن یامین نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ ہکا بکا جاتی ہوئی کار کو اور پیچھے کی سرخ لائٹ کو دیکھتی رہ گئی۔

ہما نے بہت احتجاج کیا۔ کود جانے کی دھمکی بھی دی، مگر بن یامین کان بند کیے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ صبا نے بڑے وثوق سے کہا۔

"اختر بھائی، ثنا کو لے آئیں گے۔"

شاید ہما کو بھی یقین تھا، اس لیے وہ بن یامین سے لڑی نہیں۔

ثنا کچھ دیر حیرانی کے عالم میں گیٹ پر کھڑی رہی۔ اسے بن یامین کی واپسی کی امید نہ تھی، اس لیے سست قدموں سے گھر کے اندر آ گئی۔ اختر نے پوچھا بھی کہ وہ کیوں نہیں گئی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور کمرے میں آ کر کپڑے بدل کر لیٹ گئی۔ پھر اٹھ کر کچن میں ہوا کی مدد کے لیے پہنچ گئی۔ دل بہلانے کے لیے کوئی مشغلہ چاہیے تھا۔ اپنی بے بسی پر آنسو بہانا منظور نہ تھا۔

رات کو سب واپس آئیں تو ہما کا موڈ خراب تھا اور صبا شرمندہ تھی۔

بن یامین ان لوگوں کو شادی ہال پہنچا کر چلا گیا تھا اور ابھی تک گھر بھی نہیں آیا تھا۔

ہمائے دادی کے کمرے میں جا کر بن یامین کو خوب برا بھلا کہا اور انہیں مطلع کیا۔

"آج سے میری ان سے کھلی جنگ ہے۔"

پھر دادی کی بات سنے بغیر کمرے میں آ کر منہ لپیٹ کر پڑ گئی۔

وجاہت اپنی اولاد کو بے حد چاہتے تھے خصوصاً چھوٹی بیٹی ارم ان کی لاڈلی تھی۔ ظفر سب سے بڑا تھا۔ اور باپ کی نکتہ چینی کا ہدف بھی وہی تھا، مگر ان کا انداز دوستوں جیسا تھا۔ ثنا کا دل ان کی طرف بہت لگتا تھا اور خوشی کی لہر سی دل کو گدگداتی تھی۔ بڑا سکون تھا ان کے ہاں۔

ان کی بیگم جنہیں وہ مامی کہتی تھی، اس سے بہت خوش تھیں۔ بن یامین سے بچنے کے لیے وہ چھوٹے ماموں کی طرف آ گئی۔ اس کے فوراً بعد اختر بھی آ گیا۔ گو کہ آتے ہی اس نے خاصا کڑوا منہ بنایا۔

شنی اور ماہ نہ وہیں تھیں اور انہوں نے اختر کو منہ بناتے دیکھ کر اپنا رخ موڑ لیا۔

برآمدے میں کیرم ہو رہا تھا۔ ظفر، انور اور اطہر اپنے ابا جان کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ اختر کو دیکھ کر وجاہت اٹھ گئے، بولے۔

"یار اختر! آؤ تم میری باری دینا۔ زور لگا کر جیتنے کی کوشش کرنا، میں تو سارے پوائنٹ ہار چکا۔"

مامی چاول صاف کر رہی تھیں۔ ثنا کو دیکھ کر انہوں نے کہا۔

"جاؤ تم بھی کھیلو۔"

"مامی! لائیے میں چاول صاف کر دوں۔ آپ کچھ اور کام کر لیں۔" ثنا نے کہا۔

ماہ نہ نے منہ بنا کر اسے دیکھا اور بڑبڑائی۔

"نمبر بنانا آتا ہے۔"

شنی نے ابرو چڑھا کر کہا۔ "چاول صاف کرنا مشکل کام نہیں، میں بھی کر سکتی ہوں، مگر میری نیل پالش خراب ہو جائے گی۔"

اس کی بات سن کر مامی ہنس پڑیں۔

وجاہت ماموں نے اخبار پر سے نظر ہٹا کر ماہ نہ اور شنی کو دیکھا پھر ثنا سے بولے۔

"ہاں بیٹا! تم چاول صاف کرو، تمہاری مامی چائے بنا لائیں۔ اور بھئی اختر! یہ اس قدر خاموشی سے کیوں مقابلہ ہو رہا ہے۔ کچھ لڑائی، مار کٹائی سے بھی کام لو، مقابلے کا کچھ تو لطف آئے، ورنہ ہارتے رہو گے۔"

مامی نے چاولوں کی تھالی ثنا کے حوالے کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بس ان کو تو لڑوانے کا موقع مل جائے۔"

"چچا! پھر آپ ہی تو اپنی باری دے کر گئے ہیں مجھے، آپ کی طرح کھیل رہا ہوں۔" اختر نے جواب دیا۔

"نہیں بھئی، ہم استعفےٰ دے آئے، اب تم اپنا کھیل کھیلو گے۔"

"اچھا! پھر سیاست کی قلابازیاں ملاحظہ فرمائیں۔" بچے شور کرنے لگے اور بازی الٹ کر اختر کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔ اس پر یہ فیصلہ ہوا کہ سب پہیلیاں بوجھیں۔

"ابا! پہلی باری آپ کی۔" انور نے کہا۔ جس پر سب نے تائید کی۔

"بھئی، ہمیں تو پرانی پہیلیاں آتی ہیں۔ ایک جانور ایسا جس کی دم پر پیسہ۔"

"اس پر مور کو اعتراض ہو سکتا ہے کہ جسے آپ دم کہہ رہے ہیں، وہ اس کے قابل فخر پروں کا حسن ہے۔ ابا! آج کل احتجاج چرند پرند کا بھی حق ہے۔"

"ابا! الفاظ کے چناؤ کا خیال رکھا کریں۔" اطہر نے مدبرانہ انداز میں کہا۔

ابا بے چارے ادھر ادھر دیکھ کر بولے۔

"میری اولاد کے بجائے سقراط کی اولاد ہے یہ۔"

"آپ کے سارے پوائنٹ کٹ گئے۔ اختر بھائی! آپ کوئی لطیفہ سنائیں۔"

"یار! میرا لطیفہ بھی کچھ چچا کی پہیلی جیسا ہے۔ اس پر احتجاج نہ کرنا۔ سنو! ایک قصائی سے گاہک نے کہا "میاں آج سریلا سا گوشت دینا۔"

قصائی نے کہا۔ "سنو! یہ بکرے کا گوشت ہے لتا منگیشکر کا نہیں۔"

"ہنسی نہیں آئی۔" مانہ نے ہنستے ہوئے کہا
"جھوٹ کی انتہا!" اختر نے ثنا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ٹھہریں، لڑیں مت۔" ظفر نے کہا۔

"اب میری باری ہے۔ میرا ایک دوست ہے عابد۔ گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس کا ایک کزن زاہد شہر آیا عابد سے ملنے۔ سیر و تفریح کرکے جانے لگا تو ٹیکسی کرانے پڑی۔ ٹیکسی ڈرائیور باتونی تھا پوچھنے لگا۔

"باؤ! تو اُداس کیوں ہے؟"

زاہد نے کہا، "میں تو شہر دیکھنے آیا تھا بڑی دھوم ہے اس کی۔ تو میرے دوستوں نے کہا تم شہر کے لطیفے لے کر آنا، ہم ہنسیں گے، مگر یہاں تو کسی کو بات کرنے کی فرصت نہیں، لطیفے کہاں سے لاتا؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے اُسے ایک پہیلی سنا کر کہا۔ "بوجھو پہیلی یوں ہے کہ میرے باپ کا ایک بیٹا ہے، جو میرا بھائی نہیں، بتاؤ وہ کون ہے؟"

زاہد نے بہت غور کیا۔ آخر کار ہار مان لی اور پوچھا۔

"بتا دو۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے سینہ تان کر کہا، "وہ میں ہوں۔ سنبل خان ٹیکسی ڈرائیور۔"

خیر، زاہد گاؤں پہنچے۔ دوستوں کو پہیلی سُنائی۔ "میرے باپ کا ایک بیٹا ہے جو میرا بھائی نہیں۔" دوستوں نے ہار مان لی کہا۔ "تم بتا دو کون ہے؟" انہوں نے سینہ تان کر کہا، "وہ سنبل خان ہے ٹیکسی ڈرائیور۔"

"ہنسی نہیں آئی، لطیفہ ہے خاصا۔" شنی نے منہ بنایا۔

"لطیفہ ہی ہے۔" ظفر نے مایوسی سے کہا۔
"اچھا! پھر بہت ہنسی آئی۔"
"ابا! آپ کو۔۔۔؟"
"ہاں بیٹا! ہنسی بھی آئی، رونا بھی کہ میرے بیٹے کی دوستی ایسے لوگوں سے بھی ہے جس کے کزن زاہد صاحب ہیں۔"

"ابا! آپ لطیفہ ہے یہ، دیکھیں ثنا کو تو بہت ہنسی آ رہی ہے۔"

وجاہت نے مُڑ کر ثنا کو دیکھا۔ بے ساختہ ہنسی سے اس کا چہرا گلاب کی طرح کھل گیا تھا اور اُس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ انہیں اچانک اپنی بہن یاد آگئی۔ اسی طرح ہنسا کرتی تھی وہ۔۔۔ وہ اُداس ہو گئے۔ "میرے خدا! اس معصوم کے نصیب خودی جیسے نہ بنانا۔"

"یہ بھی زاہد کے رشتے داروں میں ہیں۔" مانہ نے اپنے طور پر لطیفہ بیان کیا۔

اختر کو بھی ثنا کی ماں کی یاد آگئی تھی اور وہ اپنے چچا کے تاثرات محسوس کر چکا تھا۔ جو اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔ اختر نے کھڑے ہو کر کہا۔

"ثنا! چلو۔" اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر چل دیا۔

ثنا کچھ حیرت اور کچھ فرماں برداری کے جذبے سے ساتھ چلی گئی۔ اسے اختر کے یوں اُٹھ کر آنے اور اسے ساتھ لانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ یہاں بڑے مزے میں بیٹھی ان کی باتیں سُن رہی تھی۔ یہاں آکر اس کے سارے دُکھ اور محرومیاں ہَوا میں تحلیل ہو جاتی تھیں اور وہ بے فکری سے ان کے درمیان بیٹھ کر خوش ہوتی تھی۔

کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ چھوٹے ماموں وجاہت سے اپنی ماں اور اپنے باپ کے بارے میں بات کرے، مگر خود ہی ہمت ہار جاتی۔ اس نے بڑی مامی سے تو پوچھا بھی تھا کہ اس کی کوئی ددھیال بھی تو ہو گی چچا، پھوپھی، دادا دادی، تو انہوں نے کہا "ننھیال، ددھیال سب ایک ہی ہیں۔"

وہ چاہتی تھی کبھی چچا کے گھر جائے، کبھی پھپھو کے، مگر اندازہ ہوا کہ اس کے والد اکلوتے تھے، کبھی تو کسی کا ذکر نہیں ہوتا اور ذکر تو اس کے والد کا بھی کوئی نہیں کرتا تھا۔ اس نے خود بھی انہیں دیکھا نہیں تھا، اس لیے وہ جذباتی نہیں ہوتی تھی، البتہ ماں کے ذکر پر کبھی اُداس ہو جاتی، کبھی خوش۔ بڑے ماموں اور بڑی مامی تو اکثر "خودی" کا ذکر کرتے تھے، عموماً ثنا کی مشابہت کے سلسلے میں۔

منجھلے ماموں، مانہ اور شنی کے پاپا لیے دیے رہنے کے عادی تھے۔ وہ کبھی صبا، ہُما سے بھی

بے تکلفی سے مخاطب نہ ہوتے۔ اُن کی زندگی کا قرینہ خاصا مختلف تھا۔ وہ احباب پرست تھے۔ روزانہ شام کو میاں بیوی، بیٹیوں کو لے کر کسی دوست کی طرف چلے جاتے۔ سیر و تفریح، پارٹیاں، ہلا گلا ان کو پسند تھا۔ ان کے گھر کی پارٹی کرتیں، گھر والے کبھی شریک نہ ہوتے، بلکہ وہ خالصتاً ان کی اپنی تقریب ہوتی، جس میں سرکاری افسران، ان کی بیگمات شامل ہوتیں۔

ممانی البتہ شوہر اور بیٹیوں کے برعکس ثنا سے اچھے لہجے میں مخاطب ہوتیں، مسکرا کر بات کرتیں۔ عید بقر عید پلے سے پیار بھی کرتیں۔ ثنا ان کی خاصی ممنون تھی کہ اپنے مزاج سے ہٹ کر وہ اس کو کسی قابل سمجھتی تھیں، ورنہ رومانہ اور شاہانہ ان کی بیٹیاں تو کبھی اس سے بات بھی نہیں کرتی تھیں۔ ان کی مصروفیات انہیں اجازت نہیں دیتی تھیں۔ شاید ثنا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس سے اکھڑی اکھڑی کیوں رہتی ہیں۔ صبا بھی اس بات پر حیران تھی۔

اُس دن نانا، نانی کی گفتگو سن کر ثنا نے صبا کو بتایا کہ وہ لوگ عنقریب سب کی شادیاں کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ جوڑے بنائے جا رہے ہیں۔

"ہیں! کس کا کس کے ساتھ؟" ہُما و فورِ شوق سے کھل اُٹھی۔

"بہت آہستہ بات کر رہے تھے۔ البتہ بن یامین اور ہُما کی آواز سُنی تھی میں نے۔"

"کیا۔۔۔ کیا بن یامین اور ہُما۔۔۔" ہُما نے دانت پر دانت رکھ کر جوشِ غضب کا مظاہرہ کیا۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔ امی پھر وہ شور مچانے کے انداز میں بولی۔

"ابھی ابا سے جا کر کہتی ہوں میڈیکل مکمل کیے بغیر او۔۔۔ او۔۔۔ بن یامین۔۔۔ شٹ اپ ثنا۔۔۔!" اب ثنا پر غصہ اُتارنے کی تیاری کر رہی تھی کہ صبا نے آنکھیں دکھائیں۔

"ٹھیک ہے، میں پکڑتی ہوں نا ابھی ابا کو جا کر۔" وہ بھاگنے لگی تو صبا نے پکڑا۔

"کیا کر رہی ہو بدتمیز؟"

"ابا سے احتجاج نہ کروں؟"

"نہیں، ابھی کچھ طے نہیں ہے اور پھر۔۔۔ ابا سے اس طرح کی باتیں کیسے، اُف ہُما بے شرم۔۔۔!"

"وہ ابا ہیں میرے، کوئی ہٹوا تو نہیں، سمجھیں! ابھی احتجاج نہ کیا تو۔۔۔!" وہ جلتے جاتے پلٹ کر مکمل جواب دے رہی تھی۔

"تو کل کو ابا بھی کہیں گے، یہ ہمارے بزرگوں کا فیصلہ ہے اور شریفوں میں زبان کے وعدے۔۔۔ اُف! کیا مکالمے تھے، بھول گئی، اب گھورو تو نہیں۔"

"ہُما! باپ کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ لڑکیاں ایسے معاملے ماں سے ڈسکس کر سکتی ہیں، مگر۔۔۔!"

"مگر۔۔۔ مگر کچھ۔۔۔ میں یہ جانتی ہوں۔ ہُما اور بن یامین ندی کے دو ایسے کٹے پھٹے کنارے ہیں، جو ساتھ چل نہیں سکتے۔ یعنی ندی تو ہے کنارے غائب، اور اگر ابا نے میری بات نہ سُنی تو سمجھ لو بن یامین کی آنکھیں گئیں۔" وہ جھٹک کر ہاتھ کی انگلیوں کے ناخن دیکھنے لگی۔

"چھوڑ دوں گی ان خنجروں سے۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔

صبا جھجک کر پیچھے ہو گئی۔ اسی وقت ابا کی آواز آئی اور ہُما تیر کی طرح لپکی اور ابا کے قریب جا کر ان کے ساتھ لپٹ گئی اور لگی مِن مِن کرنے۔

"فریادی! ہم ہمہ تن گوش ہیں، اپنی فریاد پیش کرو۔" ابا شہنشاہ بن گئے۔

"ابا! یہ صبا منع کر رہی ہے۔"

"ہائیں، صبا کا اس سے کیا تعلق ہے بولو اور ہاں صبا تم سے بڑی ہے، اسے آپا کہو۔"

"ابا! آپ نے وعدہ کیا تھا ناں مجھے ڈاکٹر بنوانے کا، پوزیشن لی تھی میں نے۔"

"ہاں، مگر اب کیا پریشانی ہے؟"

"ابا! دادی ہم لوگوں کی شادیاں، یعنی میری شادی کی فکر میں مبتلا ہیں، وہ بھی کس سے بن یامین سے۔ اوہ نو، بے شک صبا کی کر دیں۔ میرا مطلب ہے صبا آپا کی کر دیں بن یامین بھائی سے۔"

ابا کے پیچھے کب امی آکر کھڑی ہو گئی تھیں۔ ہُما نے دیکھا نہیں، وہ دانت پیس رہی تھیں غصے میں اور بڑبڑا رہی تھیں۔

"بے حیا، ڈھیٹ، ذرا ادھر آ۔۔!"

"بیگم، میری چہکتی بلبل کو کچھ نہ کہنا۔ اس کے وجود سے تو میرا دل باغ باغ رہتا ہے۔"

ابا نے اسے پٹا لیا اور ہما گلاب کی طرح کھل گئی۔ ثنا اسے کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک خواب آنکھوں میں بسائے کسی دوسری نگری میں جا پہنچی۔ میں پاپا سے کہتی۔ پاپا! میں، بن یامین سے شادی نہیں کروں گی، وہ جنگلی ہے پھر پاپا کہتے "اچھا میری بیٹی، جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔"

بڑے ماموں، ہما سے کہہ رہے تھے۔

"مجال ہے کسی کی، جو میری بیٹی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کرے۔"

تو باپ ایسے ہوتے ہیں۔ بڑے ماموں جیسے شفیق، نرم دل، محبت کرنے والے، چھوٹے ماموں کی طرح بچوں کے دوست اور لندن والے ماموں کی طرح پیار لٹانے والے فرض نبھانے والے۔

کمرے کے اندر صبا اور ہما میں لڑائی ہو رہی تھی، صبا بہت خفا تھی۔

"تم نے ابا کے سامنے میرا نام لیا کیوں؟"

"تاکہ انہیں راہ دکھا سکوں۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ چھوٹی بہن کتنی ذہین ہے اور۔۔!"

"پٹائی کروں گی اب، بہت اترا گئی ہو، آئندہ تم کو جو کہنا ہو اپنے بارے میں کہنا، خبردار میرا نام نہ لینا، خواہ کوئی معاملہ ہو۔" صبا سخت ناراض تھی۔

"مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، ابا خود بہت سمجھدار ہیں۔"

ثنا کو ہنسی آ رہی تھی۔

"ویسے ہما! ماموں تم کو بہت چاہتے ہیں۔ کیا سب باپ ایسے ہوتے ہیں؟"

"ارے ایک ہزار قسمیں ہوتی ہیں باپوں کی، یہ جو چچا صاحب ہیں، وہ الگ قسم کے باپ ہیں۔ شنی آپا دکھڑے روتی رہتی ہیں، چچی ہی ان کو قابو کرتی ہیں۔"

"چچی بھی کہتی ہیں۔ دیکھو آخر ثنا بھی تو ہے، کبھی غلط فرمائش نہیں کرتی، فضول خرچی نہیں کرتی۔"

"اور رمانہ نے اس کا جواب دیا کہ وہ کس سے فرمائش کرے، اس کے ماں باپ ہی نہیں ہیں۔"

ایک تیز کسک ثنا کے دل میں ابھر کر ڈوب گئی۔ اس کڑوی سچائی کا سامنا کرنا تو ہوگا۔ رمانہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس کے چہرے پر سایہ سا آ گیا تھا۔ صبا نے نرمی سے اسے چھوا۔

"خیر، نانو دادی تو ہیں، ماں باپ سے زیادہ خیال رکھتے ہیں۔"

"صرف نانا، نانی تو۔۔!"

"پھر وہی شک۔۔"

"نانی کو مجھ سے محبت نہیں۔ یہ بات میں جانتی ہوں تم نہیں، وہ تو میرا وجود ہی برداشت نہیں کرتیں۔"

"ثنا! اس طرح تم خود کو اذیت دے رہی ہو، اس سوچ کو بدل دو۔ تم ان کی پیاری مرحوم بیٹی کی بیٹی ہو۔ ان کے وجود کا حصہ ہو، اس طرح تو شنی آپا اور رمانہ بھی شکوہ کرتی ہیں کہ ان کے پاپا ان سے محبت نہیں کرتے صرف فرض نبھاتے ہیں، کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"نانی کی حد تک ہو بھی سکتا ہے وہ مجھے تم پر قربان کر سکتی ہیں، اگر ہما کسی کام سے انکار کرے، وہ مجھے اس کام پر مجبور کر سکتی ہیں۔"

صبا نے چونک کر اسے دیکھا، وہ سمجھ گئی۔ ثنا کیا کہنا چاہتی ہے، مگر بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

بن یامین کافی دن سے کہیں گیا ہوا تھا اور نانی صاحبہ نواسے کی یاد میں ہڑک رہی تھیں، تو دوسرے نواسے اکرم کو بلوایا گیا تاکہ نانی کا کلیجہ ٹھنڈا کریں۔ اکرم نے اختر کے ساتھ مل کر خوب ہنگامہ کیا۔ دوپہر بھر کرکٹ کھیلی۔ شام کو ہاکی۔ ظفر، اطہر اور انور بھی برابر شریک رہے۔ لڑکیاں شور سے عاجز ہوتی رہیں، پڑھنے کا موقع ملا نہیں۔ ہما کھڑکی سے جھانک کر کمنٹری کرتی رہی اور صبا ایک ناول میں گم رہی۔

ثنا نے الماری سے کپڑے نکالے اور جس جس میں مرمت کی ضرورت تھی، انہیں ٹھیک ٹھاک کرتی رہی، میلے کپڑے دھو ڈالے۔

شام کو کھیل ختم ہوا تو ساری ٹیم ہما کی دعوت پر ان کے کمرے میں گھس آئی۔ صبا نے انہیں چائے بنا کر پلائی۔ ہما بک بک کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس نے

اس میچ کے دوران اپنی، صبا اور ثنا کی مصروفیات بھی وضاحت سے بیان کیں۔

اکرم کو بڑی حیرت ہوئی۔ کپڑوں کی سلائی، کپڑے دھونا، یہ لفظ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔۔ وہ دہراتا رہا۔

"کپڑے دھوئے، کپڑوں کی سلائی کی؟"

"اکرم بھائی! رہنے دیں، آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔" ہما نے مایوس ہو کر کہا۔

"بھئی! مجھے معلوم ہونا چاہیے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اتنی نازک اندام لڑکی، اتنے مشکل کام کر سکے جو کہ اجرت پر ہوتے ہیں۔" اکرم بغور ثنا کے ہاتھ دیکھ رہا تھا۔

"ہر کام ہمت اور کوشش کے ساتھ ہوتا ہے، وہ عورتیں بھی تو ہیں، جو کھیتوں میں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں، ہل چلاتی ہیں۔ کنویں سے پانی بھرتی ہیں۔"

"مگر تمہیں ضرورت کیا تھی۔ کیا ٹیلر سلائی نہیں کر سکتا، کپڑے لانڈری میں نہیں جاتے؟"

"میں آپ کی طرح لکھ پتی نہیں ہوں، اپنا کام خود کر سکتی ہوں، تو کیوں نہ کروں۔"

"بن یامین کی طرح۔" اختر نے کہا۔

اس شام عجیب بات ہوئی۔ اکرم نے روانگی کے وقت ثنا سے کہا۔

"آئندہ تم یہ کام نہیں کرو گی، اپنے ہاتھوں پہ رحم کرو۔ یہ میری برداشت سے باہر ہے۔"

اکرم کی آنکھوں میں دردمندی اور محبت کی چمک موجود تھی، جو ایک نوعمر لڑکی کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔

ثنا مرعوب ہو گئی۔ اس کے بعد بھی کئی بار اکرم کی آنکھیں اسے یہ باور کراتی رہیں کہ وہ ثنا کا ہمدرد ہی نہیں، خیر خواہ اور اس کی بہتری کا خواہاں بھی ہے اور یہاں تک کہ اس کے دکھوں کا، محرومیوں کا مداوا بھی کر سکتا ہے۔ وہ مایوسی کے بھنور سے نکلنے میں اس کا مددگار ہوگا۔ اس پہ اسے کچھ کچھ یقین سا ہونے لگا اور صبا اسے یقین دلاتی بھی رہی۔

"پھپھو تمہارے لیے بے چین ہیں۔ وہ تمہیں اپنی بہو بنانے کی حسرت میں بیقرار ہیں۔ پتا نہیں دادی کیوں چپ ہیں؟"

"کہیں وہ بن یامین کو تو۔۔ او میرے خدا! صبا، ہما کے انکار کے بعد مجھے قربان۔۔ دیکھا میں نہ کہتی تھی، وہ مجھے قربان کر دیں گی۔"

اسے بن یامین کے مقابلے میں اکرم ہر طرح سے مناسب لگا۔ کچھ اول جلول سا، کھلنڈرا سا تھا مگر انسان تو تھا بہ نسبت بن یامین کے۔

اور پھر خالہ امی اسے چاہتی بھی تھیں، مگر بن یامین کی تلوار سر پر لٹکتی محسوس ہو رہی تھی۔

"پھپھو تمہیں ہی بہو بنائیں گی دیکھ لینا۔ تین بیٹیوں کی شادیاں ان کی پسند سے کر کے اب چاہتی ہیں کہ اپنی اور اکرم بھائی کی مشترکہ پسند لائیں تاکہ اپنے ساتھ تو رکھ سکیں۔ دادی انکار نہیں کریں گی۔"

"اور وہاں عیش بھی بہت۔" ہما نے آنکھیں نچائیں۔

"نوکر، چاکر، خدمت گار، اف بادشاہی ہے۔ کرنے کو تو کوئی کام نہیں، بس آرام ہی آرام۔"

"میں ایسی بدقسمت ہوں کہ شاید ہی آرام ملے۔" ثنا آبدیدہ ہو گئی۔

ہما نے اس کا رخسار چوم لیا اور شرارت سے بولی۔

"میٹھا ہے۔" تینوں ہنس پڑیں۔

موسم سرد ہو رہا تھا۔ چھٹی کا دن یوں بھی سست گزرتا ہے، مگر ہما اس دن کو اپنے طور پر گزارنا چاہتی تھی۔ وہ جھولی بھر کینو لے کر ثنا کے ساتھ چھت پر آ گئی، جہاں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

"جامی بھائی کے ہوتے کوئی چین سے کھا بھی نہیں سکتا۔" ہما نے اپنے اوپر آ کر کھانے کا جواز پیش کیا۔

"جامی بھائی۔۔ وہ یہاں کہاں؟"

"میں نے دیکھا تھا نہیں، آئے ہیں۔" وہ کھانے کے ساتھ خوب باتیں کرتی رہی۔ اس نے باتوں باتوں میں بتایا کہ اس کے ماموں فیضی اپنے سالے کے لیے اپنی بھانجیوں کا رشتہ لینا چاہتے ہیں۔ صبا تو ٹیک ہو چکی ہے، اس لیے اس نے منہ بنا کر کہا۔

"میں ہی باقی رہ گئی ہوں اور میں دیکھے بغیر کسی شہزادے کو بھی قبول نہ کروں اور پہلے سے شرط کر

لوں گی مجھے ہے کھانے پینے کا شوق اور بھوک بھی بہت لگتی ہے، بندہ مجھے کھلا پلا سکے گا تو پھر بات بنے گی، ورنہ نہیں اور میں ایسے شوہر کی بالادستی قبول نہیں کروں گی، جو بس حکم چلایا کرے، کھانا پکوائے میں تو چائے بنانے کی بھی عادی نہیں، ہوٹلنگ ہو گی۔"

اتنی بہت سی شرطیں سن کر ثنا سناٹے میں آگئی۔ پھر اسے یاد آیا تو پوچھ لیا۔

"صبا تک ہو چکی ہے سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"صبا کو پتا ہوگا، وہ اپنے لیے راستہ چن چکی ہے۔"

"صبا نے کون سا راستہ چنا ہے۔ وہ سنجیدہ دھیمے مزاج کی، موقعہ دیکھ کر بات کرنے والی لڑکی ——— ہمدرد، غمگسار، فرمانبردار۔"

"بھئی اُن کا راستہ تو اُوپر کے کمرے میں جاتا ہے۔"

"کیا۔ بن یامین ——— اوہ ——— ہما کیا یہ سچ ہے؟"

ثنا سر تھام کر رہ گئی۔

"اُن کی مرضی، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ اُف یہ کِنو بہت کھٹا ہے، لاؤ نمک اِدھر دو۔"

"وہ تمہارے ماموں کا سالا کیسا ہے؟"

"کچھ پتا نہیں۔ اُف مرچیں تو دو، بڑا کھٹا ہے۔"

فیضی ماموں کو ثنا نے دیکھا تھا۔ وہ کئی مرتبہ آ چکے تھے۔ پہلی بار ثنا کو دیکھ کر یوں چونکے جیسے کسی بھوت کو دیکھا ہو۔ ان کی پلکیں ساکت ہوگئی تھیں۔ اچھے خوبصورت آدمی تھے۔ شاندار شخصیت۔

پچھلی عید پر وہ صبا اور ہما کے لیے بہت خوبصورت جوڑے لائے تو ثنا کے لیے بھی لائے۔ جو نانی کے کہنے پر اس نے لیا اور عید پر پہن بھی لیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ نانی فیضی کی بے حد مداح تھیں۔ بڑی خاطر کرتیں، عزت کے ساتھ بٹھاتیں۔ سر پر ہاتھ پھیر کر، کبھی ماتھا چوم کر اپنی محبت کا اظہار کرتیں۔ اتنی شفقت تو وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ بھی نہیں برتتی تھیں۔

ثنا کا خیال تھا کہ فیضی ماموں کوئی خاص ہستی ہیں۔ یا پھر انہیں مسحور کرنے کا جادو آتا ہے۔ کِنو کافی تعداد میں موجود تھے۔ نمک مرچ بھی تھا۔ چھٹی کا دن تھا اس لیے ہما بڑی تفصیل سے اپنے ماموں کی دکھی زندگی پر سے پردہ ہٹاتی رہی۔

اتنے ہنس مکھ خوش مزاج نظر آنے والے فیضی کے دل میں محبت کی ناکامی کا داغ لگ چکا تھا۔ وہ اندر سے زخمی تھے۔ نوجوانی میں ایک لڑکی سے دل لگا بیٹھے کئی سال خاموش محبت کو پالتے رہے۔ پھر انہیں احساس ہوا۔ لڑکی بھی انہیں دل سے پسند کرتی ہے۔ اپنے والدین کی رضا حاصل کر کے لڑکی کے والدین تک رسائی حاصل کی۔ قسمت اچھی تھی، اُدھر سے انکار نہ ہوا۔ اور منگنی ہو گئی۔ دونوں اس نسبت سے بے حد خوش تھے۔

لڑکی بہت حسین تھی۔ سب کہتے تھے چاند سورج کی جوڑی ہے۔ پھر فیضی اعلا تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ اور یہیں قسمت ان سے روٹھ گئی۔ پتا نہیں کیا ہوا۔ کہ یک لخت منگنی توڑنے کے اعلان کے بعد اس لڑکی کی شادی کردی گئی۔ نہ جانے اس لڑکی پر کیا اثر ہوا مگر فیضی بالکل ٹوٹ گئے۔ انہوں نے اس ناکامی کا صدمہ برسوں وہیں رہ کر برداشت کیا۔ عرصے بعد آئے تو سمجھا بجھا کر۔ قسمیں دے کر۔ ان کی شادی بھی کردی گئی۔

"اور وہ لڑکی؟"

"پتا نہیں۔ امی کہتی ہیں ہم تو لاتعلق ہو گئے تھے۔ اللہ جانے خوش ہے کہ نہ۔"

"اور یہ؟"

"مامی بہت نائس ہیں۔ وہ ماموں سے بہت پیار کرتی ہیں۔ دن رات خدمت کرتی ہیں۔ وہ ان کی پہلی محبت سے واقف ہیں۔ کہتی ہیں میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہوگا کہ میں ان کی زندگی میں شامل ہوں۔ میں ان سے محبت کر سکتی ہوں۔ بلا روک ٹوک کرتی ہوں علی الاعلان۔ اور ۔ بس۔ انہوں نے ماموں کے دل سے صدمے کا اثر ختم کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔"

واقعی لوگ اتنے بدقسمت بھی ہوتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں۔ اور پھر زخم پالتے ہیں۔ تبھی ان کی آنکھوں میں بجھتی شمعوں کی جھلملاہٹ تھی۔ ان کے چہرے پر سوز کی سی کیفیت تھی۔ آواز میں درد کا پرتو تھا۔ ان کی ہستی بڑی دلفریب تھی۔ واقعی وہ چاہے جانے کے قابل تھے۔

ثنا خود ان سے بے حد متاثر تھی۔ چھپ چھپ کر دیکھا کرتی تھی۔ ایک بار خیال آیا۔ کاش کہ یہ میرے پاپا ہوتے۔ میرے لیے کتنے فخر کی بات ہوتی۔ نانی کو یہ کیوں نظر نہیں آئے۔ حالانکہ بڑی مامی کے بھائی تھے مگر ہاں وہ تو کسی اور کو چاہتے تھے۔ پتا نہیں اس لڑکی کی زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ اسے فیضی کا خیال آتا ہوگا۔ یا وہ اپنے گھر اپنے شوہر اور بچوں میں گھر کر سب کچھ بھول چکی ہوگی۔

آج کل بھی۔ ایسی محبت ہوتی ہے؟ نہ جانے لوگ محبت کرتے کیوں ہیں جبکہ کامیابی کا یقین نہیں ہوتا۔ یا پھر۔ انہیں صلے کی ضرورت نہیں۔ ہما کے اندازے کے مطابق فیضی ماموں ابھی تک اسے نہیں بھولے اتنی اچھی بیوی اور پیارے سے بچوں کو پالنے کے باوجود۔ ان کے دل کا زخم ہرا ہے۔ اور وہ اس کی یاد میں روتے ہیں آنسو بہاتے ہیں۔

"تم لوگ یہاں ہو۔ اور میں سارے جہان میں تمہیں تلاش کر رہی ہوں۔ اچھا۔ کِنو کھائے جا رہے ہیں۔"

رانی آپا نے اچانک نمودار ہو کر دھماکا سا کر ڈالا۔

ہما کے ہاتھ سے کِنو گر گیا۔

"اس قدر چھپ کر کیوں بیٹھی ہو۔ چلو نیچے۔ وہاں منجھلے چچا کے گھر پر سب لوگ جمع ہو رہے ہیں۔"

"کیوں خیریت۔ منجھلی چچی کے بھائی جو سفیر وزیر ہیں وہ آ رہے ہیں کیا؟"

"اس سے بھی بڑھ کر۔ ثنی کا رشتہ آیا تھا۔ لوگ انگوٹھی لے کر آئے تھے۔ پتا چلا کہ وہ لوگ جامی کے دور پرے کے عزیز ہیں۔ تو چچا نے ہم لوگوں کو بلوا لیا۔"

رانی آپا جلدی جلدی کِنو چھیلنے میں لگی تھیں۔

"اچھا۔ تو ثنی آپا کی شادی بھی جلدی ہوگی۔ پھر تو تیاری کرنی پڑے گی۔ آخر ان کے وزیر، سفیر ماموں لوگ ہوں گے تو ہمیں ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ویسے کب ہے شادی؟" ہما لاپروائی سے کھانے میں لگی رہی۔

"ارے بابا! چلو تو سہی تم۔ وہاں تو بات ہی پلٹ گئی۔ ان لوگوں کو انکار کر دیا گیا کیونکہ عین وقت پر ثنی نے اس قدر ہنگامہ کھڑا کیا۔ پھپھو کو بلاؤ۔ پھپھو کو بلاؤ۔ اب جامی ان مہمانوں کو معذرت کے ساتھ رخصت کرنے گئے ہیں۔"

"اور پھپھو کا کیا ہوگا؟" ہما احمقوں کی طرح رانی کو تکنے لگی۔

"اُو ہو پھپھو سے گلے لگ کر ثنی اس قدر روئی۔ اس قدر آنسو بہائے۔ اور کہا کہ میں اتنی گئی گزری ہوں کہ آپ مجھے اپنا نہیں سکتیں؟ دراصل وہ اکرم کی شیدائی ہیں۔ بچپن سے۔ ان کے اپنے قول کے مطابق۔ تو پھپھو ہق دق مجسمہ بنی بیٹھی ہیں۔"

ہما اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "ہائیں۔ یہ تو فاؤل ہے۔ کبھی نہیں۔ اکرم بھائی ہرگز نہیں مانیں گے۔ اور چچا خود بھی نہیں مان سکتے۔ ان لوگوں کی فرمائشیں انہیں زہر لگتی ہیں۔"

ہما کھڑی ہوئی تو اس کی گود سے چھلے بے چھلے کِنو زمین پر گر گئے۔ کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتی ہما نیچے بھاگی اور ادھ مردہ قدموں سے ثنا بھی رانی آپا کے ساتھ نیچے آئی۔ رانی آپا اس کا ہاتھ پکڑے اُدھر ہی آگئیں جہاں وہ تقریب تھی۔ اور وہاں فلمی ماحول تھا۔ سامنے صوفے پر ثنی آنکھوں میں آنسو بھرے بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ بڑے اسٹائل سے گود میں رکھے تھے۔ اس نے

شاہکار "دل دریا، تن صحرا" کے بعد

رفعت سراج کا نیا ناول

"شہرِ یاراں"

چھپ کر تیار ہے

قیمت /300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی سے خریدیں

شاہکار /180 روپے، دل دریا تن صحرا /90 روپے

شفیع برادرز پوسٹ بکس 586 کراچی

فل میک اپ کر رکھا تھا۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں اور کڑے بھی تھے۔ اور ناخنوں پر اس کے سوٹ کے ہم رنگ کیوٹیکس۔

میک اپ کے باوجود اس کی سانولی رنگت پر ایک انجانا خوف تھا۔ پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس کے والد اس کے قریب بیٹھے اسے دلاسے دے رہے تھے۔

"بیٹا۔ ایسی بات تھی تو پہلے ہی بتا دیتیں۔ میں کوئی دشمن تھا تمہارا۔ آخر باپ ہوں۔ باپ تو اولاد کی خاطر اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ اور ابھی اکرم کی کسی سے منگنی بھی نہیں ہوئی تھی۔ شنا بھی اپنی بچی ہے۔ اس کا کہیں ہو جائے گا کیوں شکیلہ آپا؟"

انہوں نے اپنی بہن سے تائید چاہی جو سامنے کرسی پر بقول رانی کے ہق دق مجسمہ بنی بیٹھی تھیں۔ تو باپ ایسے ہوتے ہیں۔ شنا ماموں کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ان کے چہرے پر شفقت اور بے انداز محبت کا نور برس رہا تھا۔ ہمیشہ بیٹیوں کی فرمائشوں پر سوا نیزے پر اچھلنے والے سخت دل باپ کا سر بیٹی کی خوشی کے سامنے جھک گیا تھا۔ نہ انہیں بہن کا ساکت دم بخود مجسمہ نظر آ رہا تھا نہ یتیم بھانجی کا دکھ۔

اور سب سے زیادہ دردناک سین تو وہ تھا۔ جب مامی کے ساتھ اکرم ان کے بیڈ روم سے برآمد ہوا۔ مامی نے اس کا دلاسے دینے کے انداز میں ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ خاصا الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مگر مسکرا رہا تھا کہ مامی کی یہی مرضی تھی۔ اندر آ کر کسی بھی جانب نظر ڈالے بغیر وہ سیدھا اپنی ماں کے ساکت مجسمے کی جانب آیا۔ جھک کر ماں سے کچھ سرگوشی کی۔ پھر وہ ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ اور دیوار تکنے لگا۔ مجسمے میں حرکت ہوئی۔

شنا کی خالہ بے بسی کی تصویر بنی اٹھیں اور اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگیں۔ جو ابھی آ کر شنی کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔ پھر انہوں نے اپنی اداس نگاہیں دروازے کی سمت گاڑ دیں۔ جہاں شنا خاموش کھڑی تھی۔ پھر وہ آگے بڑھیں۔ اور اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر انہوں نے شنی کو پہنا دی۔ سب ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔ دادی نے شنی کو چوما۔

اس کے ماں باپ کو مبارکباد دی۔ پھر بیٹی کو گلے لگا لیا۔

شنی کے چہرے سے اضطراب اور خوف رفوچکر ہو چکا تھا۔ اب وہ مسکرا رہی تھی۔ ایک مشکل مرحلہ اختتام پذیر ہوا۔ اس کی جیت ہوئی تھی۔ مامی مٹھائی کا تھال لیے اپنی کا پنتی چلی آ رہی تھیں۔ انہوں نے بڑی شوخی اور محبت سے اکرم کے منہ میں پورا گلاب جامن ٹھونس دیا۔ پھر قہقہے لگاتی وہ اپنی سمدھن کی جانب بڑھیں۔

ہما سے یہ سب کچھ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ غصے میں کھول رہی تھی۔ اس نے شنا کو گھسیٹا اور اپنے کمرے میں آ کر چیزوں پر غصہ نکالنے لگی۔ کشن تکیے فرش پر پٹخے۔ گلدان دیوار سے دے مارا۔ وہ ساتھ ساتھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔

"تو یہ ہے اصلیت۔ یہ ہے محبت۔ اکرم صاحب بچو گے نہیں مجھ سے۔ ہونہہ۔ کہتے تھے۔ شنا میں میری روح ہے۔ یہ میرا خواب ہے۔ آئیڈیل ہے۔ اخوہ۔ جھوٹے۔ دغاباز۔ چھوڑوں گی نہیں۔ نہ یہ منگنی ختم کروائی تو نام بدل دینا۔ ہما نہیں چاری کہنا۔"

شنا اس کا غصہ کم ہونے کا انتظار کرتی رہی۔

"ہما۔ کیوں اپنی زبان اور دماغ خراب کر رہی ہو؟"

"اور چچا کو دیکھو۔ اتنی بڑی فرمائش کس آسانی سے پوری کر دی۔ ساری عمر بیٹیوں پر تق فن ہوتے رہے۔ اس لیے کہ ایک دفعہ ہی ان کی ساری خوشیاں دے دیں۔ دوسروں سے چھین کر!"

"چھوڑو ہما! جن کے ماں باپ زندہ ہوتے ہیں ان کی فرمائشیں پوری ہوتی ہی ہیں۔ میرا کیا ہے جیسے اب تک زندہ ہوں۔ اسی طرح آئندہ بھی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"شنا!" ہما اسے اداس دیکھ کر فوراً اس کی طرف پلٹی "تم فکر نہ کرنا۔ میں۔ میں قیمتی ماموں کے سالے کو۔ تمہیں دے دوں گی۔ بس۔" اس کے فیاضانہ انداز پر شنا کو ہنسی آ گئی۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ ہما۔ آؤ۔ چلو۔ اکرم کی منگنی کی مٹھائی کھائیں۔ سب سمجھیں گے ہمیں خوشی نہیں ہوئی۔"

"ہاں۔ نہیں ہوئی۔ مگر خیر۔ میں ان دونوں کو بھر ضرور کھلاؤں گی۔ جھوٹے کو دغاباز بے رحم۔"

اس کا غصہ پھر تیز ہو گیا تھا۔ شنا اسے چھوڑ کر باہر آ گئی۔

سانو، ظفر، اطہر اور صبا شنی کو ستا رہے تھے، گانے گا رہے تھے۔ اور شنی۔ اس کا چہرا پورا گلدستہ بنا ہوا تھا۔ اگر سامنے اس کی دادی نہ بیٹھی ہوتیں تو وہ بھی سب کے ساتھ گاتی۔ بلکہ ناچتی بھی۔ کیونکہ بے انداز مسرت اس کے چہرے، ہونٹوں اور آنکھوں میں رقصاں تھی۔

شنا کو دیکھ کر صبا نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔

"ہما نہیں آئی؟" اس نے رازداری سے پوچھا۔

شنا نے گردن ہلا کر انکار کیا۔ "رانی آپا کہاں ہیں؟"

"وہ پھپھو کے ساتھ گئی ہیں۔ اب رات کو ہم لوگ اکرم بھائی کو انگوٹھی پہنانے جائیں گے۔ اسی کا انتظام کرنے رانی آپا اور جامی بھائی گئے ہیں۔ اور چھوٹی چچی اکرم بھائی کو ساتھ لے کر ان کی پسند سے انگوٹھی لینے گئی ہیں۔"

صبا نے چپکے سے ساری تفصیل کہہ سنائی۔

شنا نے سب کے چہرے دیکھے۔ مامی تو کھلی پڑ رہی تھیں۔ آخرکار ان کی بیٹی کی خوشی پوری ہو رہی تھی۔ بڑی مامی البتہ کچھ خاموش تھیں۔ مانہ بھی مسلسل ہنس رہی تھی۔ پھر سب رات کی تقریب کے لیے لباس کا انتخاب کرنے اپنے اپنے پورشن میں چلے گئے۔

شنا واپس آئی تو ہما بڑے انہماک سے کیک اور جیلی کھا رہی تھی۔ دراصل اسے جب سخت غصہ آتا اور کوئی اس کی تقریر سننے والا نہ ملتا تو وہ اپنی بھڑاس کھانے پر نکال لیتی تھی۔ کیک اور جیلی کھانے کے بعد اس نے کہیں سے مالٹے برآمد کیے اور ان کے چھلکوں کو اپنے خنجر ناخنوں سے نوچنے لگی۔ اس کی امی آ کر جھانکا۔ پھر خفگی سے بولیں۔

"یہ کھٹے مالٹے کھا کر اپنا گلا خراب کر لوگی۔ دوپہر کو سارے کنو کھا گئیں۔ ہما۔ تمیز سے۔"

"میں نے اکیلی نے کھائے تھے کیا؟ رانی آپا نے زیادہ کھائے۔" وہ غرائی۔ اس کے لہجے سے وہ چونک گئیں۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"غصہ آ رہا ہے۔"

"چلو چھوڑو ہما۔" شنا نے جلدی سے اسے پکڑ لیا کہ کہیں وہ اپنے غصے کی وجوہات بیان کرنے لگی تو شنا کو شرمندگی ہو گی۔ ممانی بھلا کیا سوچیں گی۔

"اٹھو۔ رات کو ہم لوگ خالہ امی کی طرف انگوٹھی لے کر جا رہے ہیں۔ چلو تیاری کرو۔"

"اونہہ۔ میں۔ اور اس دغاباز کی انگوٹھی۔ ہوں ہوں ہوں۔" وہ نتھنوں سے گویا شعلے برسانے لگی۔ "دیکھنا میں انگوٹھی کو چبا کر نگل جاؤں گی۔ یوں۔" اس نے دانت کچکچائے۔ مامی سمجھ گئیں۔

"ارے لڑکی! اکرم کے لیے انگوٹھی ہیرے کی آ رہی ہے۔ کہیں تم چکھ بھی نہ لینا۔ مر جاؤ گی۔" وہ مسکرا رہی تھیں۔

ہما اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "ارے یہ تو اور اچھا ہے۔ یوں یہ تقریب نہیں ہو سکے گی۔"

"تمہارے چہلم کے بعد ہو جائے گی۔"

"کم از کم۔ میری زندگی میں تو نہیں ہو گی۔" ہما کچھ مایوس ہو گئی۔

"تمہیں غصہ کس بات کا ہے آخر؟" مامی نے بیٹی سے پوچھا۔

"بڑی مامی۔ میرے خیال میں یہ کھٹے مالٹے نقصان کر گئے ہیں۔" شنا جلدی سے بولی۔

"تم چپ رہو جی۔" ہما چلائی۔ "تمہاری ہمدردی میں تو میں آگ چبا رہی ہوں۔"

"مگر میں تو سب کے ساتھ انگوٹھی لے کر جا رہی ہوں۔" سنتے ہی ہما کھڑی ہو گئی۔

"تو۔ میں اپنا خون کرا مخواہ جلا رہی ہوں۔ تم خوش ہو شنا۔"

شنا نے کن انکھیوں سے مامی کو دیکھا۔ "ہاں بھئی۔ آخر خاندان کی تقریب ہے۔"

"تم کیا بہن رہی ہو؟ اس خاندان کی تقریب میں۔" وہ دانت پر دانت رکھ کر بولی۔

مامی گردن ہلاتی واپس چلی گئیں۔ اور ہما، شنا کو

بغاوت پر اکساتی رہی۔ اور اپنے خطرناک ارادوں سے بھی باخبر کرتی رہی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے بے شمار پکڑے ریجیکٹ کرتی رہی۔

خزاں رخصت ہوئی۔ بہار آگئی۔ بہار بھی اب چند دنوں کی مہمان تھی۔ یہی قانون قدرت ہے۔ تبدیلی۔ اور تبدیلی۔ شنی کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ساتھ ہی مانہ کی بھی رخصتی ہو جائے۔

مگر اختر کو جلدی نہ تھی۔ وہ بقول خود ایک پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ اس کی کامیابی کے بغیر شادی کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے کام کو راز رکھ رہا تھا۔ ویسے پابندی سے کہیں جاتا تھا۔ مانہ نے تو فضلو بابا کو اس کی جاسوسی پر مامور بھی کیا۔ مگر راز کھلا نہیں۔ جس عمارت میں وہ جاتا تھا۔ وہاں فضلو بابا شام تک بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ تھکے ہارے واپس آئے۔ تو پتا چلا۔ اختر تو سر شام واپس آگیا تھا۔

تین دن کی جستجو کے بعد فضلو بابا ڈھے گئے۔ انہیں اپنی ناکامی کا اعتراف تھا۔ اسی کو کامیابی میں بدلنے کے لیے انہوں نے ہما کو رازدار بنایا۔ کیونکہ وہ بھائی سے بہت قریب تھی۔

فضلو بابا یہ نہ جانتے تھے کہ وہ پیٹ کی بھی ہلکی ہے۔ یہ جاسوسی سب پر عیاں ہوئی تو اختر بہت خوش ہوا۔ مانہ کو بہت خوش ہو کر انہوں نے یہ بات بتا دی۔ جس پر اسے بڑا تاؤ آیا۔ اور اس نے اقرار کیا کہ وہ مطمئن نہیں۔ یا تو اختر چکر دے رہا ہے یا۔ اس کو کسی دوسری جگہ دلچسپی ہو گئی ہے۔

”دوسری جگہ“۔ اختر ہنسا۔ ”ویسے تمہارا اندازہ درست ہے۔ مجھے امریکہ سے دلچسپی ہو گئی ہے“

گھر میں کوئی پسندیدہ فروٹ نہ تھا۔ ہما امرود کھانا چاہتی تھی۔ امرود منجھلے چچا کے کچن کے پچھواڑے پر تھا۔ پورا درخت۔ جس میں بے شمار پھل لگتا تھا۔ مگر چچی کی اجازت اور نگرانی میں ہی توڑا جا سکتا تھا لیکن اب دوپہر تھی۔ اور وہ لوگ سب بڑی پابندی سے دوپہر کو قیلولہ کرتے تھے۔ ہما کی امی اکثر سرد آہ بھر کر کہتیں۔ ہائے! کتنے خوش نصیب لوگ ہیں۔ کہ فرصت سے سویا کرتے ہیں۔ ایک ہم ہیں۔ نیند آئے بھی تو مصروفیت اجازت نہیں دیتی۔ اور کام پھر بھی ادھورے رہ جاتے ہیں۔“

دراصل بڑے ماموں گھر کے سربراہ تھے۔ نانا۔ نانی ان ہی کے ساتھ تھے۔ پھر بن یامین اور ثنا کی ذمہ داری۔ مہمان بھی انہی کے ہاں زیادہ آتے تھے۔ کہ خاندان کے لوگ تو نانا، نانی سے ملنے آتے تھے۔ اور ویسے بھی کبھی سردی کے بستر کا انتظام کبھی گرمی کے لیے پتلی دلائیاں بن رہی ہیں۔

کہیں تریونت ہو رہی ہے۔ کپڑوں کو دھوپ دی جا رہی ہے۔ رضائیاں ادھیڑی جا رہی ہیں۔ غرضیکہ مامی بے چاری مسلسل لگی رہتیں۔

اس روز وہ کہیں گئی ہوئی تھیں اور ہما کا دل امرودوں میں اٹکا ہوا تھا۔ صبا اس کا ساتھ دینے پر تیار نہ تھی اس لیے وہ ثنا کو لے کر درخت کی طرف چل پڑی۔ اس کا استدلال تھا کہ گھر میں درخت موجود ہے تو بازار سے امرود کیوں منگائیں۔ چوری کر کے کھانے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہما بندر جیسی پھرتی سے درخت پر چڑھی۔ اور پکے اور ادھ پکے امرود گراتی رہی۔ تبھی چچا کے لاؤنج سے چچی کی آواز آئی۔ وہ کسی سے باتیں کر رہی تھیں۔ ہما نے غور کیا تو وہ فون پر باتیں کر رہی تھیں۔ کچن کا دروازہ لاؤنج میں تھا۔ اور روشن دان بھی کھلا ہوا۔ آواز بالکل صاف آ رہی تھی۔ اگر انہیں ذرا سا بھی شک ہوتا تو اپنی آواز ہی کم رکھتیں۔ فون لندن کر رہی تھیں۔ شرافت اپنے دیور کے ہاں۔ ان کی بیوی ان کی چچا زاد بہن تھیں۔

”نہیں بھئی“۔ ثنا نے بھی سنا۔ مامی کہہ رہی تھیں ”میں کب تک جوان لڑکی کو لیے بیٹھی رہوں۔ مانو کہتی ہے، اختر یہ بچا چھڑانا چاہتا ہے۔ میری لڑکی اتنی گئی گزری نہیں ہے کہ میں خوشامد کروں۔ اس کے تو کئی رشتے آ چکے ہیں۔ ہماری پوزیشن ہے بھئی۔ ہاں تم شرافت سے کہو۔ وہ اماں جان پر زور دیں۔ دونوں بہنوں کو ساتھ ساتھ رخصتی ہو جائے۔ اور اگر بڑے بھیا نے لیت و لعل سے کام لیا۔ تو میں کسی سے پوچھے بغیر مانہ کا کہیں بھی رشتہ کر دوں گی۔ اتنے بھی لعل نہیں جڑے اختر میں۔ کہ ان کے انتظار میں بیٹی کی جوانی کو گھن

لگا دوں۔ ارے ہاں۔ اختر کا کچھ پتا نہیں۔ کیا چاہتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے اس فتنی کا ہی چکر ہے۔ تم تو اسے چھوڑ کر چلی گئیں۔ الٹ کر خبر ہی نہ لی۔ تمہیں کیا پتا کیا کیا گل کھلا رہی ہیں۔ جسے دیکھو اسی کا دیوانہ۔ ارے اور بتاؤں۔ اکرم۔ اور شکیلہ آپا۔ دونوں اس کے پیچھے دیوانے تھے۔ ہاں سچ۔ بس پوچھو مت۔ کیسے ڈرامے کیے ہم نے۔ آخر وقت تک انکار کیے جا رہا تھا۔ کہ شنی تو میری بہن ہے۔ میں اسے بہن سمجھتا ہوں۔ یہ۔ وہ۔ بات وہی تھی کہ ثنا پر فریفتہ تھے۔ آخر میں نے اس کے قدموں پر اپنا دوپٹا رکھ دیا۔ ہاتھ جوڑے۔ کہ شنی مر جائے گی اکرم تیرے بغیر۔ اس کی ہمیشہ ہر خواہش پوری کی گئی ہے۔ اب وہ ضد کر رہی ہے۔ بس اس طرح بات بنی۔ شکیلہ کا تو آج تک منہ سیدھا نہیں ہوا۔ انہیں بھانجی کے بغیر کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ نہیں بھئی۔ کسی کی حق تلفی نہیں ہوئی۔ بس مجھے بھی ضد ہو گئی۔ تم خود سوچو۔ اکرم جیسا لڑکا ہاتھ سے جانے دیتی ہیں۔ خوبصورت۔ دولت مند۔ قسمت مہربان تھی کہ۔ شکیلہ آپا کا جاتی ہو۔ بھائیوں سے دبتی ہیں۔ (قہقہہ)

ثنا کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ وہ کئی بار ہما کو کھینچ چکی تھی۔ مگر ہما اسے مضبوطی سے پکڑے کھڑی تھی۔ آخر جب فون بند ہوا تو سب امرود زمین پر گرے چھوڑ کر دونوں واپس آئیں۔ ہما کی شکل پر بارہ بجتے دیکھ کر صبا نے پوچھا۔

”ملے امرود۔ کھا لیے؟“

”ہاں۔ بہت“۔ ہما کہہ کر باتھ روم میں گھس گئی۔

”میرے لیے بھی لے آتیں“۔ صبا نے کہا۔ پھر ثنا کو بستر پر لیٹتے دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”کچھ نہیں۔ میرے پیٹ میں درد ہے“۔ ثنا نے بہانا کیا۔ اس کے پیٹ میں واقعی کچھ ہو رہا تھا۔ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ صبا گھبرا گئی۔

”اتنی دیر میں کتنے امرود کھا لیے بھئی کہ درد ہونے لگا۔ لگتا ہے ہما کے بھی درد ہے“

ثنا سے برداشت نہیں ہو سکا۔ وہ رونے لگی۔

صبا گھبرا گئی۔

”ثنا! بتاؤ تو کہاں ہے درد؟“

”میرے دل میں درد ہے صبا! میں مرنے والی

ہوں۔" وہ گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔

صبا کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ "امی گھر پر نہیں۔ میں دادی کو بلاتی ہوں۔"

"کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔" ہما باتھ روم سے آتے ہوئے بولی۔ "اور پورے گھر میں اعلان کر دو۔ اب اگر کسی نے ثنا کا نام بھی لیا۔ میں سب کو کچا کھا جاؤں گی۔"

"تم سے کچھ بعید نہیں۔" صبا بڑبڑائی۔ "مگر ثنا کو۔ ہیں؟ کس نے کیا کہا ہے؟"

وہ اب سمجھ گئی مگر ہما کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا اور ثنا کے آنسو۔ صبا دادی کو بلا لائی۔ مگر ہما نے چپ سادھ لی۔ بس اتنا کہا۔

"کچے امرود زیادہ کھا لیے تھے۔"

ثنا باتھ روم میں گھسی تو نکلی ہی نہیں۔

نانی نے اپنی پوتی صبا کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"صبا! پریشان نہ ہو بچی۔ یہ عمر ایسی ہی ہوتی ہے کہ کسی کی ذرا سی بات بری لگ جاتی ہے۔ معمولی سا دھکا ٹھیس پہنچا دیتا ہے۔ سچ بات بھی تیر کی طرح دل میں چبھتی ہے۔ یہ ناسمجھی کا دور ہوتا ہے۔ ناسمجھی کا۔ الھڑپن کا۔"

"دادی! آپ کے زمانے میں ہوتا ہوگا ناسمجھی کا دور۔ اب کے زمانے میں ہم بڑی بڑی باتیں برداشت کر لیتے ہیں۔ ہم کتابوں سے سیکھتے ہیں اور باہر کی دنیا سے بڑھتے ہیں۔ جتنا ہم جانتے ہیں آپ نہیں۔"

"ہاں! بیٹی سچ کہا۔" دادی نے ہما کے تیزی سے کہے جملوں پر گردن ہلائی۔ "ہم جو تصور نہیں کر سکتے تھے۔ آج تم وہ دیکھ سن اور برت رہی ہو۔ تمہارا دور معلومات کا دور ہے۔ پھر بھی پتا تو چلے کہ ثنا کیوں رو رہی ہے۔"

"اس کا دل چاہ رہا تھا۔" ہما نے کہا۔ دادی کچھ دیر ثنا کا انتظار کر کے واپس چلی گئیں۔

کئی دن میں ہما اور صبا کے سمجھانے پر ثنا نارمل ہوئی۔ اختر نے اسے اداس دیکھا تو تینوں کو سیر کرانے لے گیا۔ جس کی اطلاع مانہ کو ہو گئی۔ بارے

ثنا نے دل کو سمجھا لیا۔ اب اسے برداشت کی عادت ڈالنی ہے۔ اگر روز ایسی باتیں ہوں۔ تب بھی صبر کے ساتھ سننا ہے۔

اختر کے بقول۔ انسان کو اپنی سمت درست رکھنی چاہیے۔ ضمیر صاف ہے تو سب ٹھیک ہے اور ثنا کا ضمیر تو صاف ہی نہیں شفاف تھا۔ کسی چشمے کے پانی کی طرح۔

وہ خالہ کو خوش کرتے ان کے گھر کئی بار گئی اور اکرم سے بھی نارمل طریقے پر ملی۔ اکرم کے دل پر بوجھ تھا۔ وہ اسے دیکھ کر کہیں چلا جاتا تھا۔ مگر خالہ امی اس پر نثار ہونے کے ہزار جتن کرتیں۔

ایک روز دادا کا پیغام ملا۔ کہ سب لڑکیاں ڈرائنگ روم میں آ جائیں۔ مانہ اور شنی بھی آ گئیں۔ صبا، ہما کے ساتھ ثنا بھی دادا کے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ جہاں پہلے سے دادا۔ اور دو صاحبان براجمان تھے۔ نئی صورتیں۔ مہمان کے چہرے پر بیزاری تھی۔ جبکہ دوسرے صاحب لاتعلق سے تھے۔ لڑکیاں سلام کر کے بیٹھ گئیں۔

ایک صاحب کے چہرے پر کچھ شوق کی کیفیت نمودار ہوئی۔ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے انہوں نے سب لڑکیوں کو بغور دیکھا۔ بلکہ جانچا۔ پھر بے بسی سے بولے۔

"ایک برابر کی ہیں سب۔ نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"نہیں۔" دادا نے لڑکیوں کے کچھ کہنے سے پہلے کہا۔ ان کی آواز میں تیزی تھی۔ "اپنا کام کرو۔ اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

"ہوں۔ یہ تو بڑی بھابی کی کاپی ہے۔" مہمان نے صبا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ نہیں ہو سکتی۔"

"یہ کالی ہے۔ یہ بھی نہیں۔" وہ اب شنی کو دیکھ کر فرما رہے تھے۔ جس پر ثنا کو ہنسی آ گئی۔

مانہ نے ثنا کو گھورا۔ اس کے گھورنے پر اور بھی ہنسی آ رہی تھی۔ وہ بمشکل اپنی کھلکھلاہٹ کو روک رہی تھی۔

"یہ۔ یہ ہو سکتی ہے۔" انہوں نے ہما کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے۔ تم۔"

"اپنے باپ کا نام بتا دو۔" دادا نے تحکمانہ انداز

میں ہما سے کہا۔

ہما کھڑی ہو گئی۔ "دادا۔ یہ کیا تماشا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ تم لوگ جاؤ۔" دادا بے حد سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ وہ سب چپ چاپ باہر آ گئیں۔ مانہ اور شنی اپنے گھر چلی گئیں۔ اور یہ تینوں اس معمے کو حل کرنے لگیں۔ یہ کیا تھا۔

"تمہارے دانت کیوں نکل رہے تھے؟" صبا نے خفگی سے ثنا کو ڈانٹا۔

"دیکھا نہیں تھا تم نے۔ ان کا تفتیشی انداز۔ جیسے مجرم کی شناخت پریڈ۔"

"نہیں جی۔ تمہیں تو شنی کے کالی ہونے کی سند ملنے کی خوشی تھی۔ بتاؤں گی اکرم بھائی کو۔"

صبا نے ہما کو گھورا۔

ہما نے ہنس کر کہا۔ "میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اکرم بھائی کو پتا چلے کہ جس کو دوسرے کالی ہے کہہ کر ریجیکٹ کر دیں۔ اس کو اکرم بھائی قبول کریں۔ زیادتی ہے۔ اور ثنا کے لیے تو میری جان حاضر ہے۔ دیکھنا۔ میں کیا حشر کرتی ہوں۔"

"شیخ چلی۔" صبا نے کہا۔

"کیا کروں۔ میں کسی کو کچھ نہیں کہہ سکتی ہوں۔ نہ دے سکتی ہوں۔ ہما تم نے میرے جیسی بے بس لڑکی نہ دیکھی ہوگی۔ جس کے پاس کچھ نہیں۔ اور جو کسی سے لینے کا حق بھی نہیں رکھتی۔ بس زندگی ہے۔ اسے گزارنا ہی سب سے مشکل لگ رہا ہے۔ مگر میں ہر مشکل سے سرخرو گزرنا چاہتی ہوں۔ تم لوگوں کی مہربانی۔" ثنا کا دل بھر آیا۔ وہ رونے کے لیے بالکل تیار تھی۔ نین کٹورے چھلکنے کو تھے۔ ہما نے اسے لپٹا لیا۔ اور اس کے گال چوم کر شوخی سے بولی۔

"کھٹا ہے۔"

ثنا کو ہنسی نہ آئی تو وہ خفگی سے بولی۔

"کیوں۔ تم ہنسیں کیوں نہیں؟"

"صبا کو اعتراض ہوتا ہے۔" وہ سادگی سے بولی۔

صبا نے اسے لپٹا لیا۔ اور سمجھانے لگی۔

"دراصل۔ میں مامی کے اس دن فون پر حیران رہ گئی تھی۔ مجھے ان سے ایسی توقع نہ تھی۔ اس لیے زیادہ دکھ ہوا تھا۔ اب میں ہر کسی سے۔ ہر قسم کی توقع رکھتی ہوں۔" ثنا نے آنکھیں رگڑیں۔

"مجھ سے نہیں۔" ہما نے آنکھیں نکالیں۔ ثنا مسکرا دی۔ مگر اس تبسم میں لاکھوں محرومیاں اور ان گنت دکھ پوشیدہ تھے۔

رات کو ہما کہیں غائب ہو گئی۔ اختر بھی نہیں تھا۔ مگر وہ کہیں گئے بھی نہیں تھے۔ کافی دیر بعد وہ گنگناتی ہوئی کہیں سے برآمد ہوئی اور صبا سے بولی۔

"پیاری بہن۔ بن یامین بھائی کا کمرا ابھی صاف کر دو۔ کیا پتا وہ آج ہی کسی وقت نازل ہو جائیں۔"

"تو پھر۔؟" صبا نے حیرت سے کہا۔

"تو پھر۔ میری شامت آئے گی۔ کیونکہ دو گھنٹے ان کے کمرے میں روپوش رہی تھی۔ کچھ چیزیں ادھر سے ادھر ہو گئی ہیں۔ اور مجھے یاد نہیں کہ کون سی چیز کہاں سے اٹھائی تھی میں نے۔ تم کو تو حفظ ہوگی ہر چیز کی جگہ۔"

صبا نے سر تھام لیا۔ اور دوڑی بن یامین کے کمرے کی جانب۔ بن یامین واقعی کبھی بھی آ سکتا تھا۔ اور کمرے کا حشر دیکھ کر آپے سے باہر بھی ہو سکتا تھا۔ ہما نے تسلیم کیا کہ یہ اس کی غلطی تھی مگر چونکہ پہلی غلطی قابل معافی ہوتی ہے اس لیے وہ بھی قابل معافی ہے۔ مگر صبا کمرے کا حشر دیکھنے کے بعد اسے پکڑ کر ساتھ ہی لے گئی۔ تاکہ وہ صفائی میں مدد کرے۔ اور یہ بروقت کارروائی ہما کی جان بچا گئی۔ کیونکہ کچھ دیر بعد ہی بن یامین کی بھاری آواز نانی کے کمرے میں آئی۔ اور صبا نے نہیں ہما نے شکر ادا کیا۔

رات کو وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں۔ تب اختر دستک دے کر آیا۔

"مجھے ثنا سے بات کرنی ہے۔" اس نے بڑے پن سے کہا۔ "اور سنو۔ ثنا بی بی۔ آئندہ خود کو بے بس بے سہارا یا بدقسمت نہ کہنا۔ ارے ہم جیسے بھائیوں کے ہوتے بہنوں کو کاہے کی فکر۔ اور یہ تم آنسو۔ نا۔ نا۔ نا۔ یہ تو کمزوری ہے۔ بزدلی۔ چھی چھی چھی۔ اتنی پیاری آنکھیں آنسو بہانے کے لیے نہیں بنی ہیں۔ ان سے دنیا دیکھو۔ اور خدا کی قدرت کے گن گاؤ۔ کوئی بات بری لگے تو مجھے بتاؤ۔"

"شکریہ اختر بھائی۔" ثنا محجوب ہو کر بولی۔

"دیکھو، تم میرے لیے صبا اور ہما سے کم نہیں ہو۔ عزیز بھی اتنی ہی ہو۔ قریب بھی اتنی ہو۔ مجھے ان دونوں کی طرح تمہارے جذبات کا پاس ہے۔ اور مفادات بھی عزیز ہیں۔ آئندہ بے پروا ہو کر زندگی گزارو۔"

اختر کے جانے کے بعد فضا خاصی خوشگوار ہو گئی تھی۔ ثنا کے دل پر اختر کی تسلیوں، محبت بھرے اقرار کا بہت اثر ہوا۔ اسے نیند بھی جلدی آگئی۔ جبکہ صبا، ہما دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ ہما نے صبا کی جرح کے نتیجے میں بتا دیا۔ کہ وہ اختر کے ساتھ بن یامین کے کمرے میں کچھ منصوبے بنا رہی تھی۔ دشمنوں کے سامنے صف آرا ہونے کے لیے۔ اور تبھی غصے اور جوش میں اس نے وہاں رکھی چیزیں ادھر سے ادھر پٹخیں۔ صبا کو ہما کی یہ حرکتیں پسند نہیں تھیں۔ اختر کے ساتھ اس کی فضول گوئی بھی شیخ چلی کے منصوبے کی طرح تھی۔

"تم کہیں خاندان میں لڑائی نہ کروا دینا۔"

"کیوں۔ ثنی آپا اور چچی نے کیا بہت قابل فخر کارنامہ انجام دیا ہے۔ جس کی داد دی جائے۔"

"ان کا فعل ان کے ساتھ۔ یہ انہی کے اعمال میں لکھا جائے گا۔"

"میں غصے میں ان باتوں کا خیال نہیں کرتی۔ اور میں نے بھائی سے کہہ بھی دیا کہ آپ اب مانہ سے شادی کریں گے تو سمجھوں گی آپ بزدل ہیں۔ چچا کی پوزیشن سے مرعوب ہیں۔ تم گھورو مت۔ ہم اختر بھائی کو اکرم بھائی بننے کی اجازت نہیں دیں گے۔ بے شک وہ کسی بھی کانی۔ لنگڑی سے کر لیں۔"

"اور۔ پہلے تم کہتی تھیں۔ مانہ چاہیے۔"

"تب اور بات تھی۔ میری بہن وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اور اب میں سو رہی ہوں۔ جاگو تم۔"

صبا سخت پریشان ہو گئی۔ اسے ہما کی کم عقلی اور جذباتیت کا اندازہ تھا۔ مگر وہ اختر بھائی کو بھی متاثر کر سکتی ہے اس کا یقین نہ تھا۔ اکرم کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ وہ ایک ڈراما تھا۔ مگر اس وقت کسی کو بھی اندازہ نہ تھا کہ ثنی اس حد تک گر سکتی ہیں۔ اپنے مفاد میں۔

ثنا کی یتیمی، بے کسی، بے مائگی کی تو کیا پروا ہوتی۔ چچا تک کو بھانجی کے مستقبل کی فکر نہ رہی۔ کتنے خود غرض لوگ ہوتے ہیں۔ کیا ثنی کو دوسرا رشتہ نہ ملتا۔ اسے ثنا پر ترس بھی آرہا تھا۔ پیار بھی۔ کس قدر اعلا ظرف اور وسیع القلب لڑکی ہے۔ چند منٹ بعد ہی گانوں میں شریک ہونے آگئی تھی۔ بے خبر سوئی ہوئی وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ معصوم پری۔ اور ہما اس وقت چڑیل لگ رہی تھی۔ وہ سوتے میں بھی شور مچاتی نہ جانے کس سے بولتی اور لڑتی تھی۔ بلکہ ڈانٹتی بھی تھی۔ صبا کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ہما سے پہلے سو جائے۔ تاکہ اس کی ہنگامہ پرور نیند اس پر اثر انداز نہ ہو۔ مگر آج وہ پھنس گئی۔ اب سونا بھی چاہتی تو نہیں سو سکتی تھی۔ ہما کی کسی سے جنگ ہو رہی تھی۔ اور وہ بولنے کے ساتھ ہاتھ بھی پٹخ رہی تھی۔

کئی دن سے "سہ گانہ محاذ" پُر امن تھا۔ دادا زیادہ تر مسجد کے ہو کر رہ گئے تھے۔ جہاں کوئی عالم آئے ہوئے تھے۔ جو عشا کی نماز کے بعد درس دیا کرتے تھے۔ اور وہ کافی دیر سے واپس آتے تھے۔

اس روز آئے تو بے حد پریشان تھے۔ رنگ اُڑا ہوا تھا۔ بستر پر گر گئے۔ پھر دادی کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا۔ اکرم جو دوستوں کے ساتھ سوات کی سیر کے لیے گیا تھا۔ کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔

خبر ملتے ہی شکیلہ سوات روانہ ہو گئیں۔ اختر ابھی ابھی گیا ہے۔ مگر کہہ گیا ہے کہ چرچا نہ کیا جائے۔ وہاں جا کر حالات کا جائزہ لے کر فون پر بتا دے گا۔ چونکہ وہ لوگ اپنے کسی دوست کے گھر قیام پذیر تھے۔ وہاں مجمع لگنے کی ضرورت نہیں۔ اختر، اکرم کو گھر لانے کا انتظام کرے گا۔

دادا نے چرچا کرنے کا منع کیا تھا مگر دادی نے ہر طرف خبر پھیلا دی۔ گھر کے لوگ سب لمحہ بھر میں دادی کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ اور محلے والوں کا بھی تانتا بندھ گیا۔

دو دن سخت پریشانی میں کٹے۔ دعائیں۔ وظیفے۔ منتیں۔ دادا تو مسجد سے آتے ہی نہ تھے۔

دادی کی نمازیں وظیفے بھی طویل ہو گئے۔

دو دن کے بعد اختر کا فون آیا۔ "اکرم کی ٹانگ چکنا چور ہو گئی تھی۔ یہاں اتنا نازک آپریشن مشکل ہے۔ یا تو ٹانگ کاٹنی پڑے گی۔ یا۔ آپریشن کا رسک لینا ہوگا۔ ڈاکٹر کا مشورہ ہے۔ انہیں لندن لے جائیں۔ وہاں ترقی یافتہ مشینری کی آسانی ہے۔ اور آپریشن بھی کامیاب ہو سکتا ہے۔ مگر۔ وہاں کے ڈاکٹروں کے معائنے کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ایک ہفتہ گزرنے کے بعد کچھ طے ہو سکے گا۔ کہ واپس لائیں یا لندن لے جائیں۔"

اتفاق یہ کہ ظفر کے والد اپنے آفس کی جانب سے نائیجیریا گئے ہوئے تھے۔ ثنی کے پاپا بھی جاپان میں تھے۔ اختر کے والد ان دنوں گٹھیا کے زوردار حملے میں بالکل معذور ہو گئے تھے۔ آرام کر رہے تھے۔ سوات کون جاتا۔ اختر کے فون کے انتظار میں سب ایک جگہ بیٹھے رہتے۔

آخر کار اختر کا فون رات ایک بجے آیا۔ اس نے اپنے والد سے بات کی۔ "وہاں ہاسپٹل کے انچارج اور ڈاکٹروں سے بات ہو گئی ہے اور ایک دو دن کے اندر ہماری روانگی ہے۔ پھپھو ظاہر ہے۔ اکیلی نہیں جا سکتیں۔ مجھے بھی ان کے ساتھ جانا ہے۔ گو کہ امریکہ سے اکرم کے بھائی پہنچ جائیں گے۔ مگر یہاں سے لندن تک کے سفر میں اکرم کی دیکھ بھال ضروری ہے۔ لندن پہنچ کر ہاسپٹل کے ضروری امور سے نپٹ کر چچا کو بھی اطلاع دوں گا۔ جا کر ملوں گا۔ اکرم دواؤں کے زیر اثر غنودگی میں رہتا ہے۔ پھپھو بہت پریشان ہیں۔ دادی سے کہیے گھر میں دعاؤں کے لیے لوگوں کو بلوا لیں۔"

دادی تو سن کر دہل گئیں۔ اکرم چھوٹا ہونے کی وجہ سے لاڈلا تھا۔ گو کہ زیادہ محبت تو بن یامین نے سمیٹی ہوئی تھی مگر اکرم بھی کم چہیتا نہ تھا۔

ثنی کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ جب سے اس نے ٹانگ کٹنے کا سنا تھا۔ رات کی نیند دن کا آرام اس کے لیے حرام ہو گیا تھا۔ دعائیں تو وہ کرتی ہی رہتی تھی۔ اب نماز بھی پڑھنے لگی۔ لندن پہنچنے کے کئی دن بعد، جو اختر کا فون آیا۔ وہ بھی پریشان کن تھا۔ اس نے کہا۔

"یہاں بھی ڈاکٹر پُر اعتماد نہیں۔ البتہ وہ پوری کوشش کریں گے۔ آپریشن کل ہوگا۔ اور اگر خدانہ کرے۔ کوئی بات ہوئی تو نقلی ٹانگ لگے گی۔ جو یہاں جدید طرز کی ملتی ہیں۔ اور کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ نقلی ہے یا اصلی۔"

اختر نے سب کو تسلی دلاسے دیے۔ شکیلہ نے بھی ماں باپ سے بات کی۔ ان سب پریشانیوں نے گھر والوں کو مسلسل اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ لیکن اس دن تو حیرت سے سب دم بخود ہو گئے۔ جب صداقت کی بیوی نے انگوٹھی لا کر ساس کے سامنے رکھ دی۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ انگوٹھی ہے امّاں جان! ان حالات میں۔ اس منگنی کا قائم رہنا مشکل ہے۔ میں اپنی بیٹی کو لنگڑے کی لاٹھی نہیں بنا سکتی۔" وہ بے رحمی سے بول رہی تھیں۔

"مگر۔ منجھلی دلہن۔ تم۔ امید کا دامن اتنی جلد نہ چھوڑو۔ پڑھی لکھی ہو۔ سمجھدار ہو۔ پھر یہ نسبت تو لڑکی کی اپنی خواہش پر ہوئی تھی۔ صداقت کو تو آنے دو۔ اس سے۔"

"میں نے صداقت سے بات کر لی۔ اور ثنی کی ہی مرضی سے یہ انگوٹھی واپس کرنے آئی ہوں۔ جو بات ایک مہینے بعد ہونی ہے۔ وہ ابھی کیوں نہ ہو جائے۔ بعد میں شکیلہ کو بھی شکوہ ہوگا۔"

"دلہن! تم نے لڑکیوں کو اس قدر آزادی دی ہے کہ وہ خود سر اور خود رائے بھی ہو گئیں۔ بزرگوں کی موجودگی میں۔ ان کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ اتنا بڑا قدم اٹھائیں۔"

"امّاں جان۔ زندگی انہی نے گزارنی ہے بزرگوں نے نہیں۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ لڑکیاں زیادہ بہتر فیصلہ کرتی ہیں۔ یہ ان کی زندگی کا معاملہ ہے۔ میرا یا آپ کا نہیں۔"

"اور اگر۔ شادی کے بعد یہ حادثہ ہوا ہوتا؟"

"تو بھی یہی فیصلہ ہوتا۔ زمانہ بہت تیز رفتار ہے۔ آپ سن نہیں رہیں۔ طلاقوں کی شرح کس قدر بڑھ

گئی ہے۔ آخر کوئی وجہ تو ہے۔"

"بس چپ رہو۔" دادی بگڑ گئیں۔ "اللہ نہ کرے کہ یہ برق رفتاری میرے خاندان کا طرۂ امتیاز بنے۔ شکر ہے کہ شادی نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ۔ تم اور تمہاری بیٹی اس قبیح فعل کی بنیاد بھی رکھ چکی ہوتیں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ تم کس قدر تیزی سے رنگ بدل رہی ہو۔"

"امّاں جان! مجھے موردِ الزام نہ ٹھہرائیں۔ یہ تو نحوست کی علامت ہے۔ اور آپ کی یہ نواسی اس نحوست کی ذمہ دار ہے۔ اکرم اسی سے شادی کرنا چاہتا تھا ناں۔ اب کردیں آپ۔"

"دلہن۔ فضول باتیں مت کرو۔ شنا نے یہ حادثہ نہیں کروایا۔"

"نہیں کروایا۔ مگر اس کی بددعا تو لگی۔ آپ شکیلہ آپا کو سمجھا دیں۔ میں اپنی بیٹی کو شعلوں میں نہیں جھونک سکتی۔ جہاں ایک منحوس کی آمد نے آگ بھڑکا رکھی ہو۔" انہوں نے بڑی کراہیت سے شنا کو دیکھا۔ جو نانا جی سے انگلش کی نظم کی تشریح کے لیے آئی تھی اور ان کے آخری جملوں کو اپنی ذات پر نشانہ بنتے دیکھ کر اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ ہاتھ پیر یک لخت سرد ہوگئے اور خون رگوں میں جمنے لگا۔ نانا جی فوراً اس کے تحفظ کے لیے آگے بڑھے۔ اسے اپنی پُرحرارت آغوش میں سمیٹ کر گرج کر بولے۔

"خبردار دلہن! اب تم ایک لفظ نہ کہنا۔ ورنہ۔"

"ابا جان آپ۔"

"میں تمہارے ظرف کی وسعت سے واقف ہو چکا ہوں۔ جاؤ۔ اور اپنے بلند تخیلات اور ارادوں کو اپنی اولاد کے لیے وقف کردو۔ خبردار شنا یا صبا یا ہما کسی کا نام تمہاری زبان پر نہ آئے۔ ورنہ۔ میں تمہیں۔"

"تم چپ رہو جی۔ مجھے بات کرنے دو۔" دادی نے ان کے غصے کو بروقت روکنا چاہا۔

"بات ختم ہوچکی ہے۔ اور اب اس سلسلے میں کوئی کچھ نہیں بولے گا۔" دادا نے رخ موڑ لیا۔

شنی کی امی تو چلی گئیں مگر شنا کی حرارت بھی ساتھ لے گئیں۔ وہ بے ہوش ہو کر نیچے لڑھک گئی۔

نہ جانے کب اسے ہوش آیا۔ کوئی دودھ پلا رہا ہے تو کوئی جوس منہ سے لگا رہا ہے۔ کبھی سوپ پلایا جا رہا ہے تو کبھی گرم چائے۔

صبا نے بتایا۔ وہ ایک گھنٹہ بے ہوش رہی۔ بن یامین نے زوردار تھپڑ رسید کیا تب اسے ہوش آیا۔ بن یامین کی انگلیوں کے نشان اس کے رخسار پر ابھرے ہوئے تھے۔ کتنی دیر وہ صدمے کی کیفیت میں گم صم رہی۔ وہ گم صم تھی مگر اس کے جذبات کی ترجمانی کے لیے ہما مسلسل دادا، دادی کے کان کھا رہی تھی۔ مسلسل مشوروں اور اصرار سے نواز رہی تھی جسے کوئی سننے کا بھی روادار نہ تھا۔ آخر اس نے لندن فون کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس پر بھی مخالفت ہوئی۔ دادی کو فکر تھی۔

"بچہ (اکرم) ہاسپٹل میں جانے کس حال میں ہوگا۔ شکیلہ کا دکھ بانٹنے والا پردیس میں کوئی نہیں۔ اب تم فون کرکے انہیں کون سی خوشخبری سناؤ گی۔ کلیجہ پھٹ جائے گا اس کا۔"

"دادی! غم بانٹنے والے ان کے بیٹے وہیں پہنچ چکے ہیں۔ ان کے بھائی ہیں۔ بھتیجے کو ساتھ لے گئی ہیں۔ آپ کے خیال میں انہیں جلوس کی ضرورت ہے۔"

"خبردار! فضول بکواس کی۔ تو۔ اللہ خیر رکھے۔ ایسے وقت میں ماں کے سوا کوئی دکھ نہیں بانٹتا۔"

"بس آپ کی ہی کسر ہے۔ چلیے اختر بھائی سے کہتی ہوں۔ آپ کے وہاں جانے کے انتظامات۔"

"ہما! تم چپ نہیں رہ سکتیں۔" صبا نے اسے ڈانٹا۔ "سب پریشان ہیں۔ کچھ احساس کرو۔"

"میں تو صرف اختر بھائی کو بتانا چاہتی ہوں۔ اکرم بھائی سن کر وقت سے پہلے صحت یاب ہو جائیں گے۔"

دادا نے اس کی رائے کو اہمیت دی۔ اور کہا۔

"بیٹا! جو کچھ کہنا ہے۔ کاپی میں لکھ لو۔ لمبی کال نہیں ہونی چاہیے۔ اور بڑھا چڑھا کر کچھ نہیں کہنا۔ صرف اکرم کی خیریت دریافت کرنا۔ شکیلہ کو تسلی دینا۔"

"دادا! سچ۔ پھپھو بہت خوش ہوں گی۔ اکرم بھائی بھی۔ ان دونوں کی مرضی کے خلاف۔"

"چپ۔ چپ۔ دیواروں کے کان ہوتے ہیں۔"

دادی گھبرا گئیں اور صبا بھی۔

"یہ تو پگلی ہے جانے کیا کہہ دے۔ دادا بھی کمال کرتے ہیں۔ ابا موجود ہیں۔ امی ہیں۔ خود دادا۔"

"میں فون بن یامین بھیا کے کمرے میں لے جاؤں گی۔"

"نا۔ نا۔ کوئی ضرورت نہیں۔" صبا چلائی۔ "کمرے کا ناس مار دے گی۔ اختر بھائی کے کمرے سے کر لو۔"

"ہاں۔ تاکہ ماہ نہ کوئی کتاب لینے آ دھمکیں اور سن کر خوشی سے ناچیں۔ واہ۔ کیا ترکیب ہے۔"

وہی ہوا۔ ہما۔ بن یامین کے کمرے میں فون لے گئی۔ اور وہ آ گیا۔ اوپر سے تیوری چڑھائے آیا۔ اور اپنی نانی کے پاس بیٹھ گیا۔ دس منٹ بعد پھر اوپر گیا۔ اور کرسی پر بیٹھ کر ہما کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اطمینان سے اٹھ کر فون کا پلگ نکال کر ہما کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود باتھ روم میں گھس گیا۔

"اصل بات اب شروع کی تھی میں نے۔" وہ چلا کر بولی اور نیچے بھاگ آئی۔

پتا چلا کہ محترمہ ابھی اکرم کی خیریت ہی معلوم کر رہی تھیں۔ اس کے ساتھ چچا۔ چچی۔ پھپھو۔ اسلم بھائی۔ اعظم بھائی ان کی بیگمات۔ بچوں کی ان کے ناموں کی معلومات۔ اور آخر میں اختر سے بات ہونی تھی تب وہ منگنی ٹوٹنے کی خبر انہیں سناتی۔ مگر بن یامین نے (جس کے صبر کا پیمانہ ایک منٹ میں لبریز ہو جاتا ہے اور دس منٹ میں دس بار چھلک چھلک گیا) پلگ نکال کر توڑ ہی دیا۔

وہ خوشخبری سنانے کی سعادت سے محروم ہو گئی۔ غصہ صبا پر نکالا۔ جس نے ناز اٹھا اٹھا کر بن یامین کو بگاڑنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

یہ خوشخبری خود شنی کی والدہ نے معذرت کے ساتھ شکیلہ کو سنا دی۔ کہ وہ صاحب معاملہ کی والدہ ہیں۔ وہ حیران بھی ہوئیں اور رنجیدہ بھی۔ مگر۔

"شنی کی یہی خواہش ہے شکیلہ آپا۔ اور اولاد کی خوشی ہی ہماری خوشی ہے۔"

انہیں علم نہ تھا۔ ان کے فیصلوں کے بدلنے میں دوسروں کو کس قدر تکلیف پہنچتی ہے۔ انہیں اپنی اور اپنی اولاد کی خوشی سے غرض تھی۔ وہ بھی آئے دن بدلتی رہتی۔ اور وہ اس تبدیلی کے عنصر اور مضمرات سے قطعاً واقف نہ تھیں۔

دو مہینے گزر گئے۔ موسم بدل گیا۔ حالات بھی خوشگوار ہو گئے۔ اکرم کی بحالی صحت کی اطلاع آ رہی تھی۔ مگر شنی کو یقین نہ تھا۔ اسے یہ البتہ یقین تھا کہ نقلی ٹانگ کے سہارے وہ چل پھر تو سکتا ہے مگر کسی ایڈوانس، پڑھی لکھی سوسائٹی میں اعلیٰ پوزیشن رکھنے والی لڑکی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے میں اسے دقت ہوگی۔ وہ احساس کمتری کا شکار رہے گا۔ اسے کبھی وہ اعتماد حاصل نہیں ہوگا جو شنی جیسی محفلوں کی جان اور تفریحات کی شائق نوجوان دوشیزہ کی اہم ضرورت ہو۔ لنگڑے کا نام سننا اسے گوارا نہ تھا کہ زندگی گزار لے۔

اور پھر اکرم اپنی ماں کے ساتھ واپس آ گیا۔ پورا خاندان اس کو مبارکباد دینے گیا۔ شنی کے سوا۔ اس پر ندامت کا ہلکا سا سایہ تو تھا۔ منگنی توڑنے پر وہ شرمندہ نہ تھی۔ مگر۔ پھپھو کا سامنا کرتے ہوئے جھجک تو ہوتی۔ اور یوں بھی اس کے ماموں نے کہیں سے اس کے لیے ایک رشتہ بھیجا تھا۔ جو سعودی عرب میں تھا۔ اب وہ اس لڑکے سے لمبی لمبی فون کالز کے ذریعے اس کی پسند، ناپسند اپنے مشاغل کے بارے میں تبادلہ خیالات کرتی۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ اسے اب کسی کی پروا نہ تھی۔

اختر واپس نہیں آیا۔ وہ کسی جاب کے سلسلے میں رک گیا تھا۔ اور شرافت کی بیوی کے کہنے کے مطابق اس نے پانچ سال کا کنٹریکٹ کر لیا تھا۔ وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ہاسٹل میں مقیم تھا۔ اس نے اس بارے میں صرف اپنے والد کو اعتماد میں لیا تھا۔

ماہ نہ اور اس کی امی کی سر توڑ کوشش کے باوجود ان کی اختر سے بات نہ ہو سکی۔ ہر بار ہی اس کا دوست فون ریسیو کرتا۔ کبھی کہتا۔ اختر تو مارکیٹ گیا ہے۔ کبھی سیر کرنے گیا ہے۔ کبھی کچھ۔ کبھی کچھ۔

ماہ نہ نے کہا کہ "اختر ان سے اکرم کے معاملے میں انتقام لے رہا ہے۔"

اور اسے اس کی جاب کا بھی یقین نہ تھا۔ اور اسی مفروضے کو بنیاد بنا کر انہوں نے رشتہ ختم

کرنے کا اعلان کر دیا۔ اب بار میاں صداقت بھی ہکا بکا رہ گئے۔ ان کی بیوی اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے ان کی رائے بھی نہیں لیں گی۔ اس کا انہیں یقین نہ تھا۔ وہ بڑے بھیا سے کافی دبتے تھے۔ احترام کرتے تھے۔ ان سے یہ کہنا کہ اختر پر انہیں اعتماد نہیں۔ اس لیے اس رشتے کو ختم سمجھا جائے۔

وہ اپنی بیوی سے اس جرات کی امید نہ رکھتے تھے وہ اماں ابا کے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

"صداقت۔ لگتا ہے تمہاری بیوی کے دماغ کا پرزہ ڈھیلا ہو گیا ہے۔ اسے کسنے کی ضرورت ہے۔ وہ جس دلیری سے ہر رشتہ توڑنے کے درپے ہیں۔ اس سے تو لگتا ہے کہ عنقریب تم سے بھی اسی طرح ناتا توڑنے کا اعلان کر دیں گی۔"

صداقت اماں سے تو شرمندہ ہوئے سو ہوئے۔ مگر بڑے بھیا، بڑی بھابی سے تو آنکھ ملانے کے قابل نہ رہے۔ مگر بڑے بھیا، بھابی اونچے ظرف کے لوگ تھے۔ انہوں نے اس فیصلے کو ایک لڑکی کی ماں کا فیصلہ جانتے ہوئے قبول کر لیا۔ اسے حق کے استعمال کی آزادی کے طور پر منظور کر لیا۔ اور اجازت دی کہ جہاں چاہیں لڑکیوں کے رشتے کریں۔ وہ ان بچیوں کو اپنی بچیاں سمجھتے ہیں۔ ہمیشہ ان کے لیے دعاگو رہیں گے۔

صداقت نے تسلیم کیا کہ غیر ضروری آزادی نے لڑکیوں کو خودسر اور گستاخ بنا دیا ہے۔ وہ بیوی سے اس معاملے میں لڑے بھی۔ اور قسم کھا کر کہا کہ اکرم اپنے اصلی پیروں سے چل کر آیا ہے۔ لندن میں اس کے پیر کی ہڈیوں کو جمع کر کے ذرا ذرا ہڈی جوڑی گئی ہے۔ یہ بات شرافت نے بتائی تھی۔ اور اب ضروری ورزش کے بعد وہ بالکل صحت مند ہو جائے گا۔ ابھی چلنے میں کچھ تکلیف ہوتی ہے۔

پچھتاوا تو ان کی سسرال کو تھا۔ خصوصاً شکیلہ نے آتے ہی جس طرح صدقے خیرات کے لیے دولت لٹائی۔ جشن صحت کی جو تیاریاں کی تھیں۔ وہ آنکھیں کھولنے کو کافی تھیں۔ نقلی ٹانگ لگوا کر کوئی اتنا شکرانہ تو ادا نہ کرے گا۔

انہوں نے شکیلہ آپا سے پھر تعلقات استوار کرنے میں ندامت محسوس نہ کی۔ معافی۔ معذرت۔ سب کچھ ہوا۔ مگر نہ شکیلہ پگھلیں نہ اکرم موم ہوا۔

شنی کی والدہ مایوس ہو گئیں۔ ان کے ولولوں پر اوس گر پڑی۔ تب اوس۔ شنی کا جو رشتہ آیا تھا۔ وہ بھی واپس ہو گیا۔ لڑکے کی ماں کو جونہی خبر ہوئی کہ لڑکی خود لڑکے سے فون پر مستقبل کے پروگرام بنا رہی ہے۔ انہوں نے اندیشوں سے گھبرا کر لڑکے کی دوسری جگہ بات طے کر دی۔

صداقت کے گھر میں تلخیوں کا راج تھا۔ خاندان میں مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ ماہ نہ اور شنی پر اعتراضات ہو رہے تھے۔ صداقت کی بیوی جہاں جاتیں۔ ان سے منگنی توڑنے کے اسباب پر بحث ہوتی۔ تنگ آ کر لڑکیوں کو انہوں نے ننھیال بھیج دیا۔ وہاں تو کسی رشتے کی امید بھی تھی۔

اس قدر الٹ پلٹ۔ تبدیلیوں کے باوجود شنا کی ذہنی کیفیت بدستور تھی۔ تنہائی کا احساس جو ہما کی باغ و بہار دوستی بھی رفع نہ کر سکی۔

اکرم کے آنے کے بعد۔ اور مامی صداقت کے دوبارہ رجوع نے اسے مسلسل خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہر آن منتظر رہتی۔ کہ کب مامی اس کے ناکردہ گناہوں کی گٹھڑی اٹھائے آئیں گی۔ اسے ذلیل کریں گی۔ اور گٹھڑی کا بوجھ اس پر ڈال کر چل دیں گی۔ مگر اب وہ ساس سسر سے خائف تھیں۔ پہلے بھی کم ہی آتی تھیں۔ اب بالکل آنا چھوڑ دیا۔

ہما کے ماموں فیضی کے آنے کی خبر گرم تھی۔ مامی بے حد مصروف تھیں۔ اس بار وہ فیملی کے ہمراہ آ رہے تھے۔ صبا ماں کے ساتھ کچن میں مصروف تھی۔ ہما محض ادھر ادھر پھر کر نکتہ چینی کر رہی تھی۔

ماموں اور ان کے سالے کے لیے اختر بھائی کا کمرا درست کر دیا گیا۔ گیسٹ روم میں ان کے بیوی بچے۔ صبا کام بھی کر رہی تھی۔ ہما پر خفا بھی ہو رہی تھی۔ جو سوائے بکھرا پھیلانے کے اور کچھ نہیں کر رہی تھی۔ ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم میں ڈسٹنگ بھی شنا نے کی۔ کیونکہ ہما کا کہنا تھا کہ اسے ڈسٹ الرجی ہے۔ اور صبا نے کہا۔

"تو آؤ پھر۔ کباب بناؤ۔ پیاز کاٹو۔ برتن صاف کرو۔"

"اونہہ۔ یہ غیر شاعرانہ کام تمہیں مبارک ہوں۔"

"لگتا ہے، میری بیٹی بیاہ کر کسی شہزادے کے محل میں رونق افروز ہوگی۔ جہاں غلاموں، کنیزوں کا اژدہام ہوگا۔ ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ نوکر ہی لقمہ منہ میں ڈالیں گے۔"

بڑی مامی بہت غصے میں تھیں۔ ہما کی ہڈ حرامی سے کوفت ہو رہی تھی انہیں۔

"یہ تجھے بدنام کروائے گی۔" انہوں نے کہا۔

"میری پیاری امی! مجھے کام سے اُلجھن ہوتی ہے۔ وقت پڑا تو کر لوں گی۔"

"بہت تکلیف ہوگی۔ پہلے سے عادت ہو تو زندگی آسان ہو جاتی ہے۔" مامی نے بیٹی کو سمجھایا۔

"شرم نہیں آتی۔ کھانے میں تو تمہارا کوئی ثانی نہیں۔ کام کے لیے نخرے۔" ضیا بھی خفا تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں سب کے ساتھ کھانا نہیں کھاؤں گی۔ تم مجھے گھورتی ہو۔ اشاروں سے منع کرتی ہو۔ اور آج تو میری پسند کا کھانا ہے۔ میں تکلف کے ماحول میں پیٹ کیسے بھروں گی۔" ہما نے کہا۔

"شاباش میری بیٹی۔ شاباش۔ پھر سب کے کھا لینے کا انتظار کرنا۔ کچن میں بیٹھ کر بعد میں کھانا۔"

"واہ۔ میں کیوں بچا کھچا کھاؤں۔ سب سے پہلے نکال کر کمرے میں لے جاؤں گی میں اور شنا کھائیں گے۔ مولا سے کہنا کباب پہلے سے تل لیں۔ ورنہ میں بغیر تلے اُٹھا لے جاؤں گی۔ اور۔"

ہما ابھی مزید کوئی اعلان کرنے والی تھی کہ مہمانوں کی آمد کی خبر ملی اور سب گیٹ کی طرف چل دیے۔

فیضی ماموں نے بطورِ خاص شنا کا تعارف اپنی بیگم سے کروایا۔ کافی دلکش خاتون تھیں۔ اور پُراعتماد بھی۔ نہ جانے فیضی ماموں کی پہلی محبت کے بارے میں کیا تاثرات ہوں گے ان کے۔ ایک طویل عرصہ کسی کو بھلا دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ جبکہ زندگی پُرسکون ہو۔ بیوی مزاج آشنا ہو۔ فیضی بھی اپنی محبوبہ کو بھلا چکے ہوں گے۔ اور وہ۔ وہ بھی۔ اگر ان کو شوہر کے گھر میں یہی سکھ ملا ہوگا۔

فیضی ماموں نے جو اعتماد اپنی شریکِ حیات کو دیا ہے اگر اس شخص نے بھی محبت اور رفاقت کے پھول ان کی جھولی میں ڈالے ہوں گے۔ تو وہ۔ بھول گئی ہوں گی۔ عورت اپنے گھر کی خاطر۔ شوہر اور بچوں کے لیے۔ ماضی کو فراموش کر دیتی ہے۔ نہ جانے۔ لوگ کیوں محبت کرتے ہیں۔ قسمت کے سامنے بے بس ہونے کے لیے۔ اتنے غیر یقینی حالات۔ ہوں تو پہلے ہی خود کو مضبوط حصار میں پابند کر لینا چاہیے۔ میں کبھی ایسی حماقت نہیں کروں گی۔ شنا نے خود کو سمجھایا۔ وہ مسلسل فیضی ماموں اور ان کی سابقہ محبوبہ کے بارے میں سوچتی رہی۔

صبح وہ اور ہما کالج جانے کے لیے باہر نکلیں تو لان میں کسی اجنبی کو چہل قدمی کرتے دیکھا۔

"لگتا ہے۔ ماموں جان کے سالے صاحب ہیں۔" ہما کا ذہن کافی تیز تھا۔ رات وہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ کسی دوست سے ملنے چلے گئے تھے۔ اور ہما نے اپنے اعلان کے مطابق اپنے کمرے میں کھانا کھایا تھا شنا کے ساتھ۔

"لگتا ہے، حفظانِ صحت کا خیال رکھتے ہیں۔" ہما نے پھر سرگوشی کی۔ پھر وہ کیاری پھلانگ کر لان میں چلی گئی۔ اور ان صاحب سے گفتگو کرنے لگی۔ دونوں آہستہ آہستہ گیٹ کی سمت بڑھ رہے تھے۔ جہاں شنا، ہما کے انتظار میں کھڑی تھی۔ قریب پہنچ کر ہما نے کہا۔

"یہ شنا ہے میری کزن۔ آپ کو اس سے مل کر یقیناً خوشی ہوئی ہوگی۔"

شنا جز بز ہو رہی تھی۔ ہما کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کیا کہنے والی ہے۔ یا کیا کرنے والی ہے۔

"آپ دونوں سے مل کر خوشی ہوئی۔" سالے صاحب مسکرائے۔ خاصی دلکش مسکراہٹ تھی ان کی شخصیت کے مطابق۔ "آپ کی ویگن آ گئی ہے۔ بہتر ہوگا کہ بقیہ باتیں کالج سے واپسی پر ہوں۔"

انہوں نے اشارہ کیا تو ہما اپنی جگہ سے ہلی ورنہ اس کا ارادہ نہ تھا۔ شنا اس سے پہلے ہی ویگن میں بیٹھ چکی تھی۔ شنا، ہما سے خفا تھی۔ اس نے بطورِ خاص

تعارف کیوں کرایا۔ انہوں نے تو پوچھا نہیں تھا۔ وہ ہر کسی سے فری ہونا پسند نہیں کرتی تھی۔ کالج سے آکر وہ نانا کے کمرے میں آ گئی۔ وہیں کھانا کھایا۔ ہما کے بار بار بلانے پر بھی نہیں گئی۔

"نہیں آئیں تو مت آؤ۔ یہ مرغِ مسلم جو امی نے ہم دونوں کے لیے رکھا ہے۔ میں اکیلی چٹ کر جاؤں گی۔ پچھتاؤ گی پھر۔" مگر شنا دال چاول کھاتی رہی۔

"اچھا۔ رات کو بریانی بن رہی ہے۔ وہ بھی نہ کھانا۔" ہما نے پھر ہانک لگائی۔

مگر ہما سے زیادہ دیر ناراض رہنا ممکن نہ تھا۔ جب زبردستی نرم نرم گلاب جامن پوری کی پوری منہ میں ٹھونس دی جائے۔ جو تازہ اور لذیذ بھی ہو۔ تو بھلا ناراضگی قائم رہ سکتی ہے۔

"دادا! میں اپنی ناراض دوست کو کمرے میں لے جاؤں؟" فرمانبردار پوتی نے پوچھا۔

"ہاں۔ ضرور۔ مگر بیٹا۔ اسے ناراض نہ کیا کرو۔ اس کا منہ پھولتا ہے۔ میرا دل سکڑ جاتا ہے۔"

"میں یہیں ٹھیک ہوں ہما۔"

"مگر میرا دل نہیں لگتا۔ اکیلے کمرے میں۔" ہما ناز سے بولی۔ "صبا تو مہمانوں میں ہی الجھی رہتی ہے۔"

"وہ نیک سرشت۔ حساس اور بہترین میزبان ہے۔ تم بھی اس سے کچھ سیکھ لو۔" دادا نے نصیحت کی۔

"وہ مجھ سے کچھ نہیں سیکھتی۔ میں کیوں سیکھوں۔ دادا۔ شنا سے کہیے نا۔ میرے ساتھ چلے۔"

"جاؤ بیٹا۔ جو محبت کرتے ہیں۔ ان کا دل نہیں توڑنا چاہیے۔ ان کی عزت احترام کرنا چاہیے۔ تم نے شعر سنا ہوگا۔

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

شنا کھڑی ہوئی تو ہما نے چھت کی طرف دیکھ کر شکر ادا کیا۔

"ابھی تم کھڑی نہ ہوتیں۔ تو میں بن یامین بھائی کو بلانے والی تھی۔ اس دن تم بے ہوش ہوئیں۔ تو کیا زوردار تھپڑ رسید کیا ہے تمہیں۔ چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میرے بھی تمہارے ساتھ۔ میں ان سے کہنے والی تھی۔ کہ ہو جائے ایکشن ری پلے۔"

شنا چپ چاپ کمرے میں آ گئی۔ وہ اس دن۔ اور اس واقعے کو بھلا دینا چاہتی تھی۔ مامی کے طرزِ عمل کے علاوہ۔ بن یامین نے یہ طریقہ کیوں آزمایا۔ اسے کیا حق تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر بھی وہ خاموش ہی رہی۔ ہما نے تو سب کے ساتھ کھانا شروع کر دیا۔ مگر شنا نانا کے ساتھ کھا لیتی۔ اگلے دن بھی نہیں گئی تو صبا نے پوچھا کہ وہ کیوں ایسا کرتی ہے۔

"بس۔ میری کسی سے بے تکلفی نہیں ہے۔ اور۔ تم جانتی ہو۔ اگر اب مامی نے۔ میرے نام کے ساتھ کوئی حرف گیری کی۔ تو میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ جبکہ تمہارے ماموں کے ساتھ وہ۔"

"تو کیا ہوا۔ وہ ماموں کا سالا ہی نہیں۔ ہم لوگوں کا بھی رشتے دار ہے۔ مامی غیر تو نہیں ہیں۔ ماموں تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں۔ شنا۔ کسی وقت تو آ جایا کرو۔ مامی۔ ان کے بھائی بے حد نفیس لوگ ہیں۔ تم سوچ نہیں سکتیں۔ ان کے دل آئینے کی طرح شفاف ہیں۔"

"مگر دوسروں کی زبان تو شفاف نہیں۔ خیر۔ آؤں گی۔" شنا زیادہ انکار نہ کر سکی۔

لوگ کسی کو اہمیت دیں۔ قدر کریں۔ تو یہ ان کی مہربانی ہے۔ ان سے نظر چرانا۔ دور رہنا۔ غرور کی علامت ہے۔ وہ مغرور نہ تھی۔ پھر یہ بھی تھا کہ وہ حالات کا سامنا کرنے کا عہد کر چکی تھی۔ اختر بھائی کے بقول۔ اپنا ضمیر صاف ہونا چاہیے۔

لان میں سب لوگ موجود تھے۔ وجاہت ماموں کی فیملی بھی۔ اور صداقت ماموں بھی۔ بیگم کہیں گئی ہوئی تھیں۔ نانی بھی فیضی ماموں کے ساتھ والی کرسی پر براجمان تھیں۔ ظفر نے کوئی لطیفہ سنایا تھا۔ جس پر سب ہنس رہے تھے۔ وجاہت نے ہنس کر بیٹے سے کہا۔

"یار! تمہارے سب لطیفے ٹیکسی اور ٹیکسی ڈرائیور کے گرد ہی کیوں گھوما کرتے ہیں۔ جب سناؤ گے ٹیکسی ڈرائیور موجود۔"

"ابا۔ ٹیکسی ڈرائیور میرا آئیڈیل ہے۔ پتا ہے کیوں؟" ظفر نے سب کی طرف دیکھا۔

اور سب شوق بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگے

سب کا خیال تھا۔ ظفر کہے گا۔ اس لیے کہ وہ محنت کش ہے۔ دن بھر ٹیکسی چلاتا ہے۔ لوگوں کو منزل پر پہنچاتا ہے۔ صبح سے رات تک محوِ سفر رہ کر اپنے خاندان کی کفالت کرتا ہے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر دور دراز کے علاقے میں جا پہنچتا ہے۔

"ابا۔ اس لیے کہ اس کے قدموں تلے ہمیشہ کار رہتی ہے۔ ہم سے ہزار درجے بہتر ہے۔ ایک ہم ہیں برسوں پرانی موٹر سائیکل لیے پھر رہے ہیں۔"

ظفر نے سب کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ نوعمر لڑکا تھا۔ اس کے ارادے بلند۔ اور خواہشات بے پایاں تھیں۔ وہ صرف روشن پہلو پر نظر رکھتا تھا۔

"بیٹا! شکر کرو۔ تم ٹیکسی ڈرائیور نہیں۔ اللہ نے تم کو موٹر سائیکل دی ہے۔ اور تم پر خاندان کی کفالت کی ذمہ داری نہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کی طرح تمہارے پانچ سات بچے نہیں۔ جو رات بھر دروازہ تکتے رہتے ہیں کہ کب غصیلا تھکا ہوا باپ گھر میں گھسے ان سب کی تیز وار پٹائی۔ اور ان کی ماں کی دھنائی کرے۔ اور کب انہیں روٹی نصیب ہو۔"

ماموں وجاہت نے نقشہ سا کھینچ دیا۔ ظفر جھینپ گیا۔

"ابا! آپ شرمندہ کر دیتے ہیں۔" فیضی نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"کوئی بات نہیں بیٹے! شرمندگی بے ضمیری سے بہتر ہے۔"

ثنا سب سے الگ کرسی پر بیٹھی تھی۔ مگر وہاں قریب ہی فیضی کے سالے صاحب آ کر بیٹھ گئے۔ ہما بھی آگئی۔ اور تسلسل سے لذیذ پھلوں اور مزے دار کھانوں کی باتیں کرتی رہی۔ پھر وہ اپنے پسندیدہ تفریحی مقامات کا ذکر لے بیٹھی۔ کہاں آئس کریم اچھی ملتی ہے۔ اور کہاں فروٹ چاٹ۔

"اور یہ ثنا تو لندن میں برسوں رہی ہے۔ وہاں کے تفریحی مقامات۔ پارکوں کا سن کر تو جی چاہتا ہے میں بھی جاؤں۔ مگر وہاں دہی بھلے یا فروٹ چاٹ نہیں ملتی۔ کیوں ثنا آئس کریم تو ملتی ہو گی؟"

وہ اچانک ادھر متوجہ ہوئی۔ تو آذر بھی اسے دیکھنے لگا۔ ثنا لندن کے ذکر پر رنجیدہ ہو جاتی تھی۔

اسے ماں کی یاد آجاتی تھی۔ ان محرومیوں اور ممتا سے دُوری۔ جو اس کے احساس پر تازیانہ بن کر لگتی تھی۔ جب وہ ہاسٹل میں تھی۔ اور تنہائی۔ اداسی مایوسی اس کے وجود میں داخل ہوئی۔ ایک ایک دن گنا کرتی۔ جب ماموں اسے لینے آتے۔ اور ایک سرخوشی کے ساتھ۔ واپس یہیں آنے کا خیال اسے آزردہ رکھتا۔

"آپ۔ بہت سنجیدہ ہیں۔ یا۔ کوئی پرابلم ہے؟" آذر اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

"یہ ماضی میں گم ہونے کا شاندار ریکارڈ قائم کر رہی ہیں۔" ہما نے لقمہ دیا۔

"ماضی زندگی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ بھولنے والی چیز نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ماضی کی خوشگوار یادوں کو ذہن کے قریب اور دکھوں کو دُور رکھنا چاہیے۔ جو مایوسی کا سبب بنتے ہیں۔"

"اور اگر۔ کوئی خوشگوار یاد۔ ہو ہی نہیں۔ پھر کیا یاد رکھے۔"

ثنا نے بلا ارادہ آذر کو دیکھا۔ دونوں ایک لمحے کے لیے کھو سے گئے۔ دونوں کی آنکھوں میں غم کی پرچھائیں محسوس کی جا سکتی تھی۔ اور وہ دونوں نے ہی محسوس کر لی۔

"بہت سے دکھ یاد رکھنا مجبوری ہوتی ہے۔ اور یہ نہ مٹنے والی یاد۔ گہرے زخم کی مانند ہوتی ہے۔" آذر آہستگی سے بول رہا تھا۔ "ہاں کئی زخم بہت گہرے ہوتے ہیں۔ بھلائے نہیں جاتے۔ جیسے ماں باپ کی دائمی جدائی کا دکھ۔ جو ماضی کا کتنا بھی پرانا واقعہ ہو۔ ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ خواہ ہمیں کتنی ہی خوشیاں مل چکی ہوں۔"

"آ۔ آ۔ آپ بھی۔" ثنا اسے ہمدرد نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ہاں۔ میرے والدین ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ایک ساتھ ختم ہو گئے۔ میں امی کی گود میں تھا۔ مگر بچ گیا۔ اور آج تک اس بات پر شرمندہ ہوں کہ میں کیوں بچا۔ کاش۔ امی۔ ابا بچ جاتے۔"

"قدرت جسے چاہتی ہے۔ بچاتی ہے۔ اور جس کا وقت آگیا ہو۔ اسے اپنے پاس بلا لیتی ہے۔"

ہما نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ "یہ مصلحتیں اس کی ہیں۔ انسان نہیں سمجھ سکتا۔"

"آپ بی اے کرنے کے بعد کیا کریں گی؟" آذر نے ماحول کی اداسی کو بدلنا چاہا۔

"شادی۔" ہما نے برجستہ کہا۔ ثنا نے اس کے پیر پر پیر مارا۔ گھورنے کی کوشش بھی کی۔

"میں امکانی اور واقعاتی جواب دے رہی ہوں۔ ورنہ ارادہ تو ہم دونوں کا ڈاکٹر بننے کا ہے۔ جی۔ لیڈی ڈاکٹر۔ قوم کی خدمت، دکھی انسانیت کی خدمت ہمارے پروگرام میں شامل ہے۔ وقت کے مطابق ڈبل فیسیں اور دونوں ہاتھوں سے دولت بٹورنا۔ مگر ثنا کے لیے یہ ناممکن ہے۔ دادی ان کی شادی اس پروگرام سے پہلے ہی کر دیں گی۔ مجھے یقین ہے۔"

آذر مسکرایا۔ "آپ کے ساتھ بھی تو یہ امکانی واقعاتی سلسلہ ہو سکتا ہے۔"

"نہیں ہو سکتا۔ میں ذرا ڈھیٹ چیز ہوں۔ اور شوہر کی بالادستی قبول کرنے سے انکاری۔"

"ہما! چپ رہو۔ تم اپنے کمرے میں نہیں ہو۔" ثنا نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ اپنے ہونے والے جیون ساتھی کے ساتھ اس قسم کے مکالمے نہ بولے۔

"چلو۔ ہم صبا کی مدد کریں۔ وہ اکیلی چائے کی ٹرالی لا رہی ہے۔ اور۔"

"صبا کو کام کا شوق ہی بہت ہے۔ اسی لیے اس کی گھر میں اہمیت بھی ہے۔ میں نے اس کی مدد کی۔ تو کام اور بڑھ جائے گا۔ تم چاہو تو جا سکتی ہو۔ ویسے وہ اکیلی بھی سب کچھ کر لے گی۔"

ثنا شرمندہ ہو رہی تھی۔ مگر ہما کا وہاں سے اٹھنے کا پروگرام نہ تھا۔ شاید وہ آذر کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ وہ صبا کے ساتھ سب کو چائے سرو کرنے لگی۔ مگر آذر کی نظریں اس کا تعاقب کر رہی تھیں اور یہ بات وہ محسوس کر رہی تھی۔

شکیلہ نے اکرم کا جشنِ صحت یابی بہت دھوم دھام سے منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ خاندان کے علاوہ اپنی سسرال اور دیگر احباب۔ اپنے بیٹوں کے دوستوں اور تینوں کی سسرال والوں کو بھی مدعو کیا تھا۔

"اتنا خرچ کر رہی ہیں۔ میری رائے کی کوئی اہمیت نہیں۔ اچھی بھلی شادی ہو جاتی اتنے پیسوں میں۔" ہما نے مایوسی سے کہا۔ "اتنا کہا میں نے پھپھو! بے جا اسراف خدا کو ناپسند ہے۔ آپ تو سیدھے طریقے سے شادی کر دیں۔ ایک پنتھ دو کاج۔ اچھا تھا ناں۔ کیوں ثنا؟" وہ ثنا کو بھی ہم رائے کرنا چاہتی تھی۔

"تم سے کوئی مشورہ نہیں مانگ رہا۔" صبا بگڑی۔ "ان کی مرضی۔ جو چاہیں کریں۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ ہما تم پٹو گی کسی سے۔"

"سچ اور حق۔ ان کی خاطر جان بھی جائے۔ تو بندی حاضر ہے۔"

شکیلہ کا محل نما مکان۔ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ لگتا تھا شادی کی تقریب ہے۔ اندر لان میں ہر پیڑ پر رنگین روشنیوں کے دھارے بہہ رہے تھے۔ بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ بہت سے مہمان جمع تھے۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ اکرم قیمتی لباس میں ادھر سے ادھر مبارکباد قبول کرتا پھر رہا تھا۔ شکیلہ کی خوشی ان کے چہرے سے ہی نہیں۔ پورے وجود سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

ثنا سب سے آخر میں کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ جہاں پہلے ہی لڑکیوں کی ٹولی خوش گپی کے نغمات الاپ رہی تھی۔ ہما کو دوست نظر آگئیں۔ صبا، شکیلہ کے پاس چلی گئی۔ کافی دیر بعد صبا اسے تلاش کرتی آئی۔ کھانا شروع ہونے والا تھا۔

"چلو اکرم بھائی کو صحت یابی کی مبارکباد دے آئیں۔" صبا نے اسے زبردستی اٹھایا۔

اکرم ایک خوبصورت منقش کرسی پر بیٹھا تھا۔ سب اسے مبارکباد دے رہے تھے۔ صبا، ہما اور چند کزنس وہاں ایک ساتھ جا کر مبارکباد دینے لگیں۔ ثنا آ تو گئی تھی۔ مگر اب صبا کے پیچھے کھڑی تھی۔ اسے صداقت ماموں کی نظریں اپنے جسم پر چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اکرم نے سب کی مبارکباد خوش دلی سے قبول کی۔ پھر ثنا کو چپکے کھڑا دیکھ کر بول اٹھا۔

"ثنا! کیا تم کو میری [illegible]"

"میں تو ہر نماز کے بعد دعا کرتی تھی۔" شناز جلدی سے بولی۔

"او ہو۔ تو یہ تمہاری دعاؤں کے اثر سے میں جلدی صحت یاب ہوا ہوں۔ میں سوچتا تھا امی کے سوا اور کون ہے جو میرے لیے دعا گو ہے۔ یا پھر نانی اماں، نانا ابا۔"

"جناب! ہم بھی دعائیں کرتے تھے۔" صبا ہما یک زبان ہو کر بولیں۔

"شکریہ، شکریہ۔ آپ سب کی محبت اور سچے دل سے مانگی ہوئی دعاؤں نے مجھے آج خوشی کا یہ دن دکھایا ہے۔"

"اگر پھپھو میری بات مان لیتیں تو آج کا دن اس سے زیادہ خوشی کا ہو سکتا تھا۔"

ہما بولی پھر ہما نے اکرم کے کان میں سرگوشی کی۔ جس پر وہ زور سے ہنسا۔

"ہاں بھئی۔ ویسے تم میری نجات دہندہ ہو۔ کافی جنگ لڑی ہے تم نے میرے ساتھ۔ اب میں بہت ہلکا پھلکا ہوں۔"

"جنگ تو قدرت نے لکھ دی تھی نصیب میں۔ ورنہ میری طاقت کہاں تھی۔"

سب ہنس بول رہے تھے۔ شناز دور ہٹ گئی۔ صداقت مامی آج بھی اس پر نظروں کے تیر برسا رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھی جلدی سے گھر چلی جائے۔ نانی سے کہا تو انہوں نے کہا۔

"کھانا ہو جانے دو۔"

وہ دور ایک کونے میں چلی گئی۔ اور خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ادھر اتنی روشنی نہ تھی۔ ایک دم کسی آہٹ پر چونک گئی۔ آذر۔ ساتھ والی کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ بہت گھبرا کر شناز نے اسے دیکھا۔ صداقت مامی نہ دیکھ رہی ہوں۔

"آپ اتنی الگ الگ اور اداس کیوں رہتی ہیں۔ آج تو سب بہت خوش ہیں۔ صرف آپ ہی چپ چپ ہیں۔ کیا کوئی خاص۔ بات۔"

شناز نے اس ہمدرد کو بے بسی سے دیکھا۔ کیا کہے ہر سمت روشنی تھی۔ ہر طرف خوشی تھی۔ صرف وہ ایسی ہستی تھی جس کے اندر تک اندھیرا تھا۔ اور خوشی اس سے دور تھی۔

"آپ خوفزدہ ہیں، کس سے؟ یہاں تو سب آپ کے اپنے ہیں۔" وہ کتنا زیرک تھا۔

وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ ہاتھ سے ہاتھ رگڑنے لگی۔ بولنے کی کوشش کی تو آواز پھنس کر رہ گئی۔

"بتائیے شنا! آپ کیوں خوفزدہ ہیں۔ کس سے ڈر رہی ہیں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ مجھ پر بھروسا کر کے دیکھیں۔ کیا کسی نے آپ کو ڈرایا ہے؟ کس سے ڈر رہی ہیں آپ؟ پلیز بتائیے!"

شنا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ بے حد شفاف، بے ریا آنکھیں تھیں۔ ہمت بندھانے والی۔

"میں کسی سے نہیں۔ بس قسمت سے۔" وہ بمشکل بول پائی۔

"مگر۔ قسمت تو میری بھی کچھ اچھی نہیں۔ میں تو خوفزدہ نہیں ہوا۔"

"آپ۔ مرد ہیں۔ اور۔"

"میری آپا تو عورت ہیں۔ جب وہ کم عمر تھیں۔ امی، ابا ختم ہو گئے۔ انہوں نے مجھے ماں بن کر پالا۔ لیکن ہم چچا کے گھر رہے۔ جہاں ظاہر ہے امی، ابا جیسا کوئی نہ تھا۔ ہم اداس ہوتے تو ایک دوسرے سے باتیں کر کے غم ہلکا کرتے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی آپا کو آپ کی طرح گم صم یا اداس دیکھا ہو۔"

شنا کے دل میں ان دونوں بہن بھائی سے ہمدردی کے جذبات جاگ اٹھے۔ وہ کہہ نہ سکی۔ تم تو ان کے غم خوار تھے۔ میرا کوئی بھائی نہیں۔ جو میرا غم ہلکا کرے۔

"جو لوگ ہمت ہار دیتے ہیں شنا۔ وہ خود اپنے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔ آپ مایوس نہ ہوں۔ آپا کے لیے لوگ کہتے تھے۔ اس بے چاری کا تو کوئی نہیں۔ چچا بھی فوت ہو گئے۔ آپا کہتی تھیں میں بے سہارا نہیں ہوں۔ حالانکہ میں بہت کم سن تھا مگر آپا نے مجھے مرد بنا رکھا۔ میں بھی آپا کے لیے ہر کسی سے لڑنے کو تیار رہتا تھا۔ چچی کے انتقال کے وقت تو ہر کوئی ہمیں قابل رحم کہہ رہا تھا۔ واقعی ہمارا کوئی سہارا نہ تھا۔ گھر کرائے کا تھا۔ اور کوئی تعجب نہ تھا کہ مالک مکان ہم سے گھر خالی کرانے آ جاتا۔ لیکن قدرت کو

مدد منظور تھی۔ عین وقت پر فیضان بھائی کا رشتہ آ گیا۔ وہ بھی اس طرح کہ چچی کے مرنے پر جو پرسے کے لیے لوگ آئے تھے۔ انہی کی موجودگی میں نکاح ہو گیا۔ اور ہم نے اس عارضی سہارے کو خیرباد کہا۔ آپا کے تن پر جو لباس تھا اسی میں نکاح ہو گیا۔ وہ تو بعد میں فیضی بھائی کے ہاں کے آئے ہوئے کپڑے زیور پہنائے گئے۔ میں اس کسمپرسی کا حال بتا رہا ہوں کہیں۔ اور فیضی بھائی نے وسعت قلبی اور اپنی ہمدرد فطرت کی بنا پر مجھے بیٹا بنا کر رکھا۔ اور آج آپا کو ہر خوشی اور اطمینان حاصل ہے۔ اور میں۔ جو کچھ ہوں۔ آپ کے سامنے ہوں۔"

وہ شوخی سے مسکرایا۔ شنا کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

"آپ۔ مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ شنا۔ آپ ہنستی رہا کریں۔"

کیسی فرمائش کر دی تھی آذر نے۔ شنا جھجک کر کھڑی ہو گئی۔

"پھر۔ خوف آپ کی آنکھوں میں اتر آیا۔ ارے میں نے کیا کہہ دیا کہ۔"

اسے خبر نہ تھی۔ وہ شفاف دل والا۔ جو دنیا کی میلی آنکھوں اور کڑوی زبان کے زہر سے نا آشنا تھا۔

"میرے اور آپ کے حالات زندگی۔ کافی حد تک ایک جیسے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں۔ کیا آپ۔ کیا تم۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو گی؟" آذر کیا کہہ رہا تھا۔ وہ سمجھی نہیں۔

"میں آپ کا خوف۔ غم۔ اداسی سمیٹ لینا چاہتا ہوں۔ جس طرح بچپن میں۔ آپا میرے فکر سمیٹتی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کے رازدار ہو سکتے ہیں۔ آپ ایک بار آزما کر دیکھیں۔"

نہ جانے وہ کیا کہہ رہا تھا۔ شنا کی آنکھوں کے سامنے ایک وسیع سمندر تھا۔ پرسکون۔ ہلکورے لیتی لہروں میں چاند کا عکس ڈوب اور ابھر رہا تھا۔ چاندنی نے ٹھنڈی چادر بن کر ہر منظر کو ڈھانپ دیا۔ سکون۔ سکھ۔ اور گنگناتی امید۔

وہ خواب سے چونک گئی۔ اب ہر سین تحلیل ہو چکا تھا۔ اور ہر طرف خوف کے پہرے تھے۔

مگر آذر کا سکون رخصت ہو گیا تھا۔ وہ چاند کی تمنا کر رہا تھا جس کا حصول ناممکن تھا۔ شنا اسے ٹالتی رہی۔ وہ خواب دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ ایسا خواب۔ جس کی تعبیر آنسوؤں سے مزین ہو۔ اسے آذر کے شوق اور آرزو میں اپنی بدنامی نظر آ رہی تھی۔ وہ صداقت مامی سے ہی نہیں ہر کسی سے چھپتی پھرتی۔ نہ جانے کوئی کیا کہہ دے۔

وہی ہوا۔ جس سے وہ ڈرتی تھی۔ فیضی مامی نے نانی کی خدمت میں حاضر ہو کر شنا کو آذر کے لیے مانگا۔ اس وقت فیضی بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس گھر کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں کوئی بات راز نہیں رہ سکتی تھی۔ ہما نے خود اسے یہ بات بتائی۔ اس کا لہجہ روکھا روکھا تھا۔ یہ حیرت زدہ کرنے والی بات ہی تھی۔ فیضی ماموں تو ہما کو آذر کے لیے منتخب کر چکے تھے۔

"تم یقین کرو ہما! میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔" وہ ہما کے اترے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔ ہما چپ رہی۔ شاید اسے یقین نہ تھا کہ ایسا ہی ہے۔ ہما کی خاموشی اس کے اعصاب پر بوجھ بن رہی تھی۔ اب یہ خبر عام ہو چکی تھی۔ نہ جانے اب صداقت مامی کے تاثرات کیا ہوں گے۔

ہما کی خاموشی صبا کے لیے بھی تکلیف دہ تھی۔ اس کی ہر وقت کی بک بک کے سبھی عادی ہو چکے تھے۔ صبا نے شنا سے پوچھا۔ وہ تو اس سے چھپا نہ سکی۔ ہر بات کہہ سنائی۔

"میں جانتی ہوں۔" صبا نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "ماموں جان نے کوئی بددیانتی نہیں کی۔ ان کا پہلے یہی خیال تھا۔ پھر انہیں تم پسند آ گئیں۔ آذر بہت ہی پیارا لڑکا ہے۔ ماموں چاہتے ہیں اس کی ہر خواہش ہر خوشی پوری کریں۔ انہوں نے تم دونوں کا نام اس کے سامنے رکھا تھا۔ آذر نے کہا کہ ہما میں بہت بچپن ہے۔ اس کے تو کھانے پینے کے دن ہیں۔ اور یہ کہ جو بھی اس کی زندگی میں شامل ہو۔ وہ اس کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔ سمجھ سکے دونوں ایک دوسرے کو سچی خوشی دے سکیں۔ اور شنا میرے مزاج کے مطابق ہے۔ آخر اس میں ہما کی خفگی کی کوئی تک ہے؟"

ایک شخص اپنی پسند۔ ذہنی ہم آہنگی کی بات کرتا ہے زبردستی تو نہیں کی جا سکتی۔"

"نہیں صبا! سارا قصور میرا ہے۔ میں آزر سے ہما کے حوالے سے ملتی رہی۔ اور کل ہی تو میری ان سے بات ہوئی۔ جب انہوں نے کہا۔ ہما بچی ہے۔ جذباتی پُرجوش، مگر ناسمجھ۔ اور انہیں سنجیدہ و حساس لڑکیاں پسند ہیں۔ میں نے کہا لڑکیاں تو خود کو حالات کے مطابق ڈھال سکتی ہیں۔ نرم شاخ کی مانند جسے جدھر چاہو موڑ لو۔ تو آزر نے کہا وہ کسی شاخ کو موڑ کر اس کی ہئیت تبدیل کرنا پسند نہیں کریں گے۔ یہ تو نرم شاخ پر ظلم ہوگا۔ صبا یقین کرو، میں نے کبھی ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔"

"مجھے یقین ہے۔ اور میں جانتی ہوں۔ اس معاملے میں زیادہ قصوروار ہما خود۔ اور سب سے کم تم ہو۔"

"نہیں۔ میں خود کو بے قصور نہیں سمجھتی۔ مجھے۔ آزر سے دُور ہی رہنا چاہیے تھا۔"

"او بے وقوف! چپ رہو۔ جانتی ہی نہیں۔ ماموں دراصل آئے ہی تمہارے لیے تھے مامی کو لے کر۔ ورنہ ہما مامی کی تو شکل دیکھی بھالی ہے۔ مامی نے کہا۔ میں خود دیکھوں۔ فیضی جس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر رہے ہیں۔ اور قسمت کی بات ہے کہ انہیں اور آزر کو بھی آزر کے لیے تم پسند آئیں۔ یہ بزرگوں کی باتیں ہیں شنا۔ تم افسوس نہ کرو۔ جو قسمت میں ہے۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا۔"

صبا دیر تک سمجھاتی رہی۔ ہما سے بھی بات کی۔ ان کے تعلقات میں کشیدگی آگئی تھی۔ شنا نے ہما سے معافی بھی مانگی۔ مگر ہما کی چپ نہ ٹوٹی۔ شنا نے بھی اب خاموشی اختیار کر لی۔

موسم بہت گرم ہو گیا۔ حبس نے اندر باہر گھٹن کر دی تھی۔ کوئی راستہ نہ تھا۔ ایک بار کھل کر بارش ہو جائے تو۔ نہ جانے نانی اور نانا کیا سوچ رہے ہیں۔ آزر نے اس کا باہر نکلنا مشکل کر دیا۔ اس کا زیادہ وقت کمرے میں گزرتا۔ یا نانی کے کمرے میں۔ وہاں آزر آجاتا۔ وہ اس سے مخاطب نہ ہوتا مگر اس کی نظروں میں کچھ مقناطیسی کشش تھی۔ وہ ایک جگہ تھم کر رہ جاتی۔ نظریں کتاب پر جمائے۔ ایسے میں پلکیں ساکت ہوتیں۔

آزر کی نظروں کے سوال کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ شاید اسی لیے اس دن فیضی مامی نے اسے کچن میں گھیر لیا۔ اسے پکڑ کر گیسٹ روم میں لے گئیں اب ان کے سوالوں کے جواب۔ تلاش کرنے کے لیے پوری صلاحیت صرف کرنی پڑی وہ بھی اپنے اوپر گزرے محنت دنوں کی کہانی سُناتی رہیں۔ پھر فیضی کی شکل میں جو انعام انہیں ملا۔ فیضی بے مثال انسان محبت، شفقت، نرمی اور گداز ان کی رگ رگ میں بسا ہوا ہے۔ اور ان کی یہ خواہش ہے کہ شنا اپنی تمام محرومیاں۔ سارے دُکھ۔ تمام خوف جھٹک کر ایک ایسی پناہ میں آجائے۔ جہاں محبت ہو، تحفظ ہو۔ احساس ہو۔ اور وہ پناہ گاہ آزر ہے۔ آزر جو فیضی کا دوسرا روپ ہے۔

"کیا آزر میں کوئی کمی یا خرابی ہے؟" انہوں نے اس کی خاموشی پر جھلا کر پوچھا۔

"وہ مجھے آنٹی۔"

"آنٹی نہیں۔ مجھے آپا کہو۔" وہ بگڑی ہوئی تھیں۔ "اگر کسی چیز کو ہم پسند کرتے ہیں۔ تو لازم تو نہیں کہ اسے حاصل بھی کریں۔ ہم ہر اچھی چیز کے مالک نہیں بن سکتے۔ ہو سکتا ہے، وہ بہت قیمتی ہو۔ ہماری دسترس سے باہر ہو۔ ہم پسند کریں گے۔ تعریف کریں گے۔ وہ۔ کسی دوسرے کی ضرورت ہے تو اس کے لیے چھوڑ دیں گے۔"

مامی نے اسے بغور دیکھا۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتی رہیں۔ شنا نظریں جھکائے رہی۔ آپا کہنے کا حق اسے نہ تھا۔

"ہوں۔ بہت حساس۔ نرم دل۔ ایثار پسند۔ مگر بی بی جی۔ میری بات غور سے سنیں۔ وہ چیز" (زور دے کر) "قیمتی ہے۔ دسترس سے باہر نہیں۔ کسی کی ضرورت کا سوال نہیں۔ اس چیز پر کسی دوسرے کی ملکیت کا ٹھپہ نہیں لگا۔ ضرورت تو بہت لوگوں کو ہے۔ مگر اس کے حصول کا حق ایک ہستی کو ہے۔ اور میں چاہتی ہوں۔ وہ حق تمہیں حاصل ہو۔"

"میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی۔" اس نے دل پر

جبر کر کے کہہ دیا۔ اور دیر تک وہیں کانپتی رہی۔ دل کے خلاف فیصلہ کتنا اذیت رساں ہوتا ہے۔

"خود کو دھوکا دینا انسانیت کو دھوکا دینا ہے۔ جو چھپانا چاہتی ہو، وہ ہی نہیں چھپ رہا۔ بیج بویا نہیں۔ تو پھوٹا کیسے۔ پھوٹ چکا تو کونپل کیوں کر نکلی۔ اور کونپل بڑھتی ہے۔ پودا تناور درخت بن جاتا ہے۔ اس درخت کو گرا سکو گی؟" شنا سنّاٹے میں آگئی۔

یہ کیسا تجزیہ تھا آنٹی کا اس کی ذات کے بارے میں۔ دھک دھک دھک۔ رات کے سنّاٹے میں وہ اپنی دھڑکنیں گنتی رہی۔ ایک لمحے بھر کا خواب زندگی کا روگ نہ بن جائے۔ اس پودے کو تناور درخت نہیں بننا چاہیے۔ اکھاڑ پھینکنا ہوگا۔ دوستی کے تقدس کی خاطر۔ ہاں۔ جب دوستی کا خیال کیوں نہ آیا۔ بیج بویا کیوں۔ وہ تو پھوٹے گا۔ اور جب پھوٹ گیا تو اسی دوستی کے احترام میں۔ اسے فوراً کیوں نہ پھینک دیا۔ کونپل نکلنے کا انتظار کیوں کیا۔ اور اگر کونپل نکل آئی تھی۔ اسے اسی وقت فنا کیوں نہ کیا۔

"قصوروار تم ہو بی بی جی" اس نے آنٹی کے الفاظ دل میں دُہرائے۔ ان کی ضد کہ مجھے آپا کہو۔ اور اس کا گریز۔ اسے اپنے رویے پر شرم آرہی تھی۔ اتنی محبت سے۔ پیار۔ اپنائیت سے۔ انہوں نے اسے کچھ سوالات حل کرنے کو دیے۔ اور وہ۔ جواب چھپائے۔ کمرۂ امتحان سے بھاگ آئی۔

ہما کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ نہ ہو۔ وہ ڈر رہی تھی۔ وہ کب چپ رہتی ہے۔ شنا کی دو منٹ کی خاموشی۔ اسے خفگی برداشت نہ کرنے والی۔ تین دن سے بالکل چپ کا روزہ رکھے ہوئے تھی۔ اسے بار بار مخاطب کرنے میں شنا کو اپنی ہتک محسوس ہونے لگی۔ منانا آتا نہ تھا۔ کیسی روکھی پھیکی زندگی اس نے گزاری تھی۔

نانی نے اسے بلایا۔ وہ گئی تو کمرے میں بن یامین بیٹھا تھا۔ ہل ہل کر نانی کو دبا رہا تھا۔ کمر۔ شانے۔ پیر۔ پنڈلی۔ وہ اس کے مردانہ ہاتھوں کی سختی پر احتجاج بھی کر رہی تھیں۔ اور آرام آنے پر دعائیں بھی دے رہی تھیں۔ "اوئی۔ اوئی۔ اوئی" انہوں نے آخری بار صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے اسے ہاتھ مار کر دبانے سے روکا۔ بن یامین الگ ہوا اور پھر ان کی کمر سے لپٹ گیا۔ نانی کا پُرشفقت ہاتھ اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔

کتنا خوش نصیب ہے بن یامین۔ اسے نانی کا قرب۔ ان کی شفقت، محبت اور سایہ نصیب ہے۔ ایک میں ہوں۔ میرے لیے نانی کا سلوک۔ خشک درخت کا تنا بن جاتا ہے۔ جس میں حرکت نہ حرارت نہ سایہ۔ اسے دیکھ کر بن یامین اٹھ کر باہر چلا گیا۔

"آؤ۔" نانی نے کہا۔ "آج تمہارے نانا مسجد میں ہی قیام کریں گے۔ اس لیے تمہیں بلا لیا۔ اکیلی ہوں نا۔ اگر جی نہ چاہے تو۔ رہنے دو۔ صبا کو بلا لیتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سو جاؤں گی۔" وہ نانی کے بستر پر لیٹ گئی۔

نانی نہ جانے کیا کر رہی تھیں۔ کبھی الماری کھولتیں۔ کبھی کھڑکی پر کچھ تلاش کرتیں۔ پلنگ کے نیچے ہاتھ مارتیں۔

"نانی آپ کیا تلاش کر رہی ہیں؟"

"ہاں۔ لو۔ وہ میری صندوقچی۔ نہ جانے کہاں رکھ دی میں نے۔"

"وہ پلنگ پر۔ تکیے کے پاس رکھی ہے۔"

"اچھا۔ اے لو۔ دیکھا۔ یہ حال ہو گیا ہے میرے دماغ کا۔ کچھ یاد نہیں آتا۔ ابھی خود رکھی تھی بھول گئی۔"

نانی بڑی پُراعتماد تھیں۔ تبھی تو نانا پر حاوی تھیں۔ اور ان کے دماغ کا یہ "حال" ہونے پر شنا بھی ان کے ساتھ حیران ہو گئی۔ صندوقچی سے دوا نکال کر کھانے کے بعد انہوں نے اسے الماری میں رکھا۔ لائٹ آف کی۔ صحن میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی کمرے میں بھی جھانک رہی تھی۔ اندھیرا نہ تھا۔ مگر پورا اُجالا بھی نہیں۔ ہما تو لائٹ جلا کر سونے کی عادی تھی، کیونکہ اندھیرے میں اسے نیند نہیں آتی تھی۔ اور صبا کا خیال تھا کہ وہ خوابوں میں ڈر جانے

والی جگنوں کو روشنی میں بہ آسانی دیکھ سکتی ہے اور فتح بھی حاصل ہوتی ہے۔ ثنا بھی اب تو لائٹ کی عادی ہو گئی تھی۔ مگر نانی کے کمرے کا مٹیالا سا اُجالا بڑی ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔ اور خوشگوار لگ رہا تھا۔

"تم سے۔ ایک بات کرنی ہے۔" ٹھنڈے ہلکے سے مدھم اجالے میں نانی کی آواز اور لہجہ بھی مدھم تھا۔

"مجھ سے؟ جی کہئے۔"

یقیناً بن یامین نے شکایت کی ہوگی۔ پرسوں اس دن کچن میں وہ اپنے لیے چائے بنانے کا منتظر رہا۔ اور میں ہٹی نہیں کیونکہ ناناجی کے لیے حلوہ بھون رہی تھی۔ اس وقت بھی اس کی جبیں پُرشکن تھی۔ نہ جانے اس شخص کو کیا بیر ہے مجھ سے۔ اونہہ۔ میں تو اس کے چہرے کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔ جنگلی اجڈ چلے گا تو راستے میں آنے والی ہر چیز کو ٹھوکر مارتا ہوا۔

"بیٹا! بات یہ ہے کہ نہ تو یہ میرا منصب ہے۔ نہ ہی قاعدہ۔ کہ نانی ہو کر نواسی سے ایسی بات کروں۔ مگر مجبوری ہے رازداری کی وجہ سے۔ تم سے خود کہنے پر مجبور ہوئی ہوں۔"

الٰہی خیر۔ یہ کیسی تمہید ہے۔ اور نانی کا پیار بھرا لہجہ تو ٹھنڈی پھواریں سی برسا رہا ہے۔

وہ بے خودسی ہو گئی۔ "جی۔ نانی کہئے۔"

"بیٹا۔ بچیاں بڑی ہو جاتی ہیں۔ تو ان کو پرائے گھر جانا پڑتا ہے۔ یہ دُنیا کا دستور ہی نہیں۔ شریعت کا حکم بھی ہے۔ تمہارے ماں باپ ہوتے تو وہ تمہاری مرضی اور خوشی معلوم کرتے۔ شکیلہ کا اصرار ہے کہ۔ تمہیں ان کے حوالے کیا جائے۔ اکرم کی اگر شنی سے چند روزہ منگنی نہ ہوئی ہوتی۔ تو اب تک وہ تمہیں اپنے گھر لے جا چکی ہوتیں۔ باقاعدہ۔ ادھر فیضی نے۔ اپنے سالے کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔ بہت چاہت اور بڑے مان سے۔ وہ لڑکا بھی کوئی غیر نہیں۔ اور اکرم بھی اپنا ہی ہے۔ شکیلہ کو بھی ناں، نہیں کر سکتی۔ اور فیضی کو کیسے مایوس کروں۔ الجھن میں ہوں۔ تم ہی بتا دو۔ کس کو ہاں کروں۔ شکیلہ کو۔ یا فیضی کو۔ فیضی کی قرض دار ہوں۔ مگر۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم پر کوئی دباؤ نہیں۔"

ثنا اپنی جگہ سُن ہو گئی۔ نانی جیسی کھردری خاتون (خاص اس کے ضمن میں) اس پر دباؤ ڈالنے کی قائل نظر نہیں آتیں۔ اور قرض کا ذکر بھی کرتی ہیں۔ اور پھر ہما۔ مگر اسے صرف اس بات کا جواب دینا تھا جو نانی نے پوچھا۔

"سوچ کر دل کو کنٹرول کر اطمینان سے جواب دینا بچے۔ یہ تمہاری پوری زندگی کا معاملہ ہے۔"

اس کے اندر سے چیخیں باہر نکلنے کو بے تاب ہو گئیں۔ پوری زندگی [illegible] گئی تھی۔ خالہ امی اسے بہت چاہتی ہیں۔ وہ جانتی تھی۔ وہ زیادہ بولنے یا اظہار پر قادر نہ تھیں مگر ان کی آنکھیں، ان کا چہرا، ثنا کو دیکھتے ہی چمک اور کھل جاتا۔ اسے اپنی آغوش میں یوں چھپا لیتیں۔ جیسے مرغی چوزوں کو چیلوں سے بچاتی ہے۔ اکرم۔ اتنا اول جلول بھی نہیں۔ اسے چاہتا، پسند کرتا ہے۔ اور منگنی ٹوٹنے پر اس نے بے حد خوشی منائی تھی۔ وہ سادہ اور نیک ہے۔ تبھی صداقت مامی کے دباؤ میں آ گیا۔

فیضی ماموں نہ جانے کیوں اس قدر مہربان ہیں۔ جب بھی سامنا ہوتا۔ ان کی آنکھیں چمک اُٹھتیں۔ وہ اسے دیکھتے رہتے۔ پیار سے، نرمی سے۔ کاش فیضی ماموں میرے پاپا ہوتے۔ ان کے چہرے پر کتنی ملائمت اور ہاتھوں کے لمس میں کس قدر شفقت اور اپنائیت ہوتی ہے۔ آرزو۔ ان کا پرتو ہے۔ پُرسکون سطح سمندر پر ہلکورے لیتا چاند کا عکس۔ کس قدر دل فریب خواب۔ کیسا حسین منظر۔ مگر۔ خواب خواب ہی ہوتا ہے حقیقت نہیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ آرزو۔ نہ جانے کب اس کے دل کی پنہائیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آرزو۔ اس نے نہیں کی تھی۔ مگر اب۔ وہ پودا درخت بن رہا تھا اور اسے نوچ کر پھینکنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔

ہما جو اس کے لیے ہر کسی سے لڑ بیٹھنے کو تیار رہتی تھی۔ اس کے لیے سینہ سپر۔ دوست ایسی کہ جان کی بازی لگا دے۔ اب کیسی خشک اور بے نیاز تھی۔ ان کی محبتوں، عنایتوں کا قرض

کیسے اُتارے۔ کیا یہ موقع اسے مل نہیں رہا۔ اس سے فائدہ اُٹھانا۔ اس کے اپنے اختیار میں ہے۔ یہ دوستی اتنی سطحی تو نہ تھی۔ اور مجھے مانو یا شنی کی خود غرضی پسند نہیں۔ تو ان کے نقشِ قدم پر چلنا۔ دوستی کی توہین۔ ایثار و قربانی کی ہتک ہے۔ دل کو مضبوط کر کے۔ آنسوؤں کو اندر ہی اندر روک کر اس نے کہہ دیا۔

"آپ۔ فیضی ماموں کو منع کر دیں۔" آواز پھنس گئی۔ مگر۔ نانی نے سن لیا۔

"میں نے کہا تھا۔ سوچ کر بتانا۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔"

نانی مڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔ جو تکیے کے اندر منہ گھسا چکی تھی۔ اسے اپنے دل کی قوت کا اندازہ نہ تھا۔ ذرا سی بات پر ٹھنڈا پڑ جانا۔ بے ہوش ہو جانا۔ اور یہ تو زندگی ہار دینے والا فیصلہ تھا۔ اسے پتا ہی نہ چلا کب آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوئیں اور تکیہ تر بتر ہو گیا۔ دوستی کی خاطر۔ دوستی نبھانے کے لیے۔ آنسو ہی کافی نہیں ہوتے۔ وہ اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر چکی تھی۔ اندھیرے میں نانی کو اس کا چہرا صاف نظر نہیں آیا تو آنسو کیا نظر آتے۔ مگر وہ کروٹ بدلنے لگی تو ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں ستارے کی طرح چمکتے۔ ہیرے کی طرح دمکتے آنِ واحد میں نظر سے اوجھل ہو جانے والے آنسو اس کی زبان سے کہی بات۔ اور فیصلے کی نفی کر رہے تھے۔

صبح حسبِ معمول ناشتے کے ہنگامے کے ساتھ طلوع ہوئی۔ کچن سے اُٹھنے والی خوشبوئیں۔ برتنوں کی کھنک۔ بچوں کی صدائیں۔ نانا مسجد سے آ چکے تھے۔ نانی ان سے باتیں کر رہی تھیں۔ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ وہ محبت کی آواز کو دبا بیٹھی۔ آرزو سے دستبردار ہو گئی۔ اس کا دل دوستی پر قربان ہو گیا اور وہ پورا دن خونِ آرزو کا سوگ مناتی رہی۔ شام تک ارادے میں مضبوطی آ ہی گئی۔ اور پھر آرزو سے اس کی ملاقات ہو گئی۔

"آپ۔ مجھ سے چھپ کر یہاں بیٹھی ہیں۔" وہ انکار کر سکی۔

"ثنا! میں سچے دل سے آپ کی طرف بڑھا تھا۔ پُرخلوص دل لے کر۔ آپ کے حوالے سے بھائی جان نے مجھے بڑے خوبصورت خواب دکھائے تھے۔ میں ان کی تعبیر تلاش کرتا ہوا آیا تھا۔ نہ جانے میرے جذبے میں کھوٹ ہے۔ یا آرزو صادق نہیں۔" بڑے دردمندانہ انداز میں آرزو نے ثنا کو دیکھا تھا۔

5 خوبصورت کتابوں کا سیٹ

شائع ہو گیا ہے

* ہمارا پیارا پاکستان
* ہمارے پیارے قائدِ اعظم
* ہمارے علامہ اقبال
* ہمارے لیاقت علی خان
* ہماری فاطمہ جناح

ان کتابوں کو پڑھ کر آپ کو جہاں پیارے وطن پاکستان کے بارے میں بہت کچھ جان سکیں گے وہاں قائدِ اعظم محمد علی جناح بانیٔ پاکستان محترم لیاقت علی خان شاعرِ مشرق علامہ اقبال اور محترمہ فاطمہ جناح کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر سکیں گے۔ اور ہاں یہ کتابیں آپ کو تقریری مقابلے، معلوماتِ عامہ کے مقابلے، مضمون نویسی اور امتحان میں بھی بہت مدد دیں گی، یہ کتابیں خوبصورت بکس میں پیک کی گئی ہیں تاکہ آپ دوستوں کو تحفے میں بھی دے سکیں۔
ان کتابوں کا سیٹ آپ کو ہر بک اسٹال پر ملے گا۔

مکمل پانچ کتابوں کا سیٹ: 36/- روپے

سول ایجنٹ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اُردو بازار کراچی

"میں خواب نہیں دیکھتی، اگر دیکھتی ہوں تو اعتبار نہیں کرتی۔ کہ اس کی تعبیر اُلٹی ہوتی ہے۔"

اب جب کہ ہر بات ختم ہو گئی، اور وہ اپنا فیصلہ نانی کو سُنا چکی تو باقی کچھ رہا نہیں۔ اب صاف بات کرنے میں حرج نہ تھا۔

"اور آپ غلط راستے پر آتے ہوئے چونکے بھی نہیں۔ آپ کے حوالے سے جانے بھی کچھ خواب دیکھے تھے۔ انکل فیضی نے ۔۔ اسے بھی آپ کی راہ پر ڈالا تھا۔ نجانے پھر کیا ہوا۔ انکل فیضی نے کیوں راہ بدلی۔ اب آپ بھی یہ راستہ بدل لیں۔ ہما بے حد محبت کرنے والی لڑکی ہے۔"

"یوں تو کوئی اپنی زندگی فنا نہیں کرتا ثنا ۔ میں تو خیالات تبدیل کرنے پر بھی آسانی سے تیار نہیں ہوتا۔ آپ کہہ رہی ہیں راستہ بدل لوں۔ یہ انصاف تو نہیں۔" اس کے لہجے میں دلی کرب جھلک رہا تھا۔

ثنا حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اتنے کم عرصے میں۔ چند ملاقاتوں میں ۔ وہ کتنی دور نکل گیا تھا۔

"خدا نہ کرے۔" اس کے منہ سے نکلا "آپ کی زندگی کو کچھ ہو۔ لیکن ۔ میں سچ کہتی ہوں۔ ہما ہر معاملے میں مجھ سے بہتر ہے۔ وہ سچی اور انصاف پسند ہے۔ آپ اسے کھو کر پچھتائیں گے۔ اس میں محبت اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کسی کے ساتھ ذرا سی زیادتی کو وہ برداشت ہی نہیں کرتی۔"

اپنے طور پر تو وہ ہما کی پوری وکالت کر رہی تھی۔

"آپ بہت اچھی دوست ہیں۔ اپنی سہیلی کے لیے ایسے نیک جذبات رکھتی ہیں۔ لیکن شاید محبت کی طاقت اور عظمت پر یقین نہیں رکھتیں۔ میں ۔ اپنی محبت کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہوں ثنا ۔ آپ کا مشکور ہوں۔ کہ مجھے اتنی دیر برداشت کیا۔ میری دعا ہے کہ آپ جہاں رہیں خوش رہیں۔"

ثنا یک لخت سناٹے کی زد میں آ گئی۔ اس کی آواز اور لہجہ جذبے کی شدت اور سچائی کا گواہ تھا۔ اندر سے کوئی اُبال سا اٹھا۔ وہ سمجھ بھی نہ سکی۔ اور آن واحد میں اس کی آنکھیں نمکین پانیوں میں ڈوب گئیں۔ آنسوؤں کی یلغار سے بچنے کے لیے وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بھاگتی ہوئی اندر غائب ہو گئی۔

"تمہاری یہ گیلی آنکھیں ۔ تو کچھ اور ہی کہہ رہی ہیں ثنا۔"

وہ بڑبڑایا۔ اور نئے سرے سے پُر امید ہو گیا۔

سب کچھ ختم تو ہو گیا تھا۔ اب کسی سے کہنا تھا نہ کسی کی سُننی تھی۔ زندگی کا یہ موڑ عجیب سے حالات لایا تھا۔ جو سوچا نہ تھا۔ وہ ہو گیا۔ وہ کہتی تھی لوگ محبت کرتے ہی کیوں ہیں۔ جب انجام کامیابی نہیں۔ حالات موافق نہیں۔ اور خود اس بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گئی۔

محبت تو اکرم بھی اس سے کرتا ہی تھا۔ مگر وہ اتنا جوشیلا نہ تھا۔ اس قدر غیر یقینی نہ تھا۔ اگر آج اس کے بغیر کوئی اور لڑکی سامنے ہو۔ اور کوئی مجبوری اس کو حصار میں لے لے۔ وہ ثنا کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ اور مجبوری سے سمجھوتا کرے گا۔ مضبوط ارادے۔ اس نام کی کوئی چیز اکرم کے پاس نہ تھی۔

پھر بھی ۔ وہ اسے ہی منتخب کرنے پر مجبور تھی۔ خالا امی کی محبت کا حصار تو تھا۔ اور بہت مضبوط حصار تھا۔ کیا ہوا اکرم لمبے لمبے ڈائیلاگ نہیں بول سکتا۔ عیش آرام دے سکتا ہے۔ اس کی گفتگو ۔۔۔ فلمیں، اداکار۔ اداکارائیں۔ بالی وڈ۔ اور دوستوں تک محدود تھی۔ نیک اور سادہ۔ خوش رہنے والا۔ بس اتنی ہی تعریف ہو سکتی تھی، اس کی۔ بہت کوشش کی کوئی اور خوبی بھی تلاش کر کے دل کو تسلی دے مگر۔ آنکھیں بھرنے لگیں۔ دل میں گھٹن ہونے لگی، سانس رُکنے لگا۔ راستہ بدلنا کس قدر مشکل ہے۔ اس نے سوچا اور کمرے سے باہر آ گئی۔

اگر نانی جانتیں کہ اگلے پل کچھ بھی ہو سکتا ہے، تو وہ اپنی زبان کو روک لیتیں۔ آواز پہ بند باندھ لیتیں انہیں کیا علم تھا کہ رات کے آدھے پہر تک ثنا نیند کے انتظار میں جاگتی اور دل کو سمجھاتی رہے گی۔ اور پھر بے چینی اور اضطراب کو تازہ کرنے کے لیے کمرے سے نکل کر صحن میں آ جائے گی۔ نانی کی آواز یوں بھی کم نہ تھی، اور نانا تو کچھ اونچا سُنتے بھی تھے، پھر انہیں یہ شک تک نہ تھا کہ کوئی ان کی باتیں سُن سکے گا۔

آدھی رات کو۔ جب سارا جہاں محوِ خواب تھا۔ ثنا ہی غم کی ماری۔ بوجھل دل کو بہلانے۔ گھٹن سے نجات پانے کے لیے باہر ٹہل رہی تھی۔ نانا، نانی کی باتوں کی آواز

آ رہی تھی۔ پہلے تو اس نے غور ہی نہیں کیا۔ اسے اپنے حال کی خبر نہ تھی، مگر اتفاقاً ٹہلتے ہوئے وہ نانی کے کمرے کے پاس سے گزری تو اپنا نام سُن کر۔ نانی کی رونے کی آواز پر ٹھٹھک گئی۔

نانی روتی جاتی تھیں اور کسی "کل موہنے" کو کوس رہی تھیں۔ جو نامراد کمینہ ذلیل ہونے کے ساتھ مردود بھی تھا۔ نانا انہیں سمجھا رہے تھے۔ اور وہ مری ہوئی بیٹیوں کو یاد کر کے آنسو بہا رہی تھیں۔ صبا ٹھیک کہتی تھی۔

"دادی راتوں کو روتی ہیں۔ اور دادا انہیں چُپ کراتے ہیں۔ یہ لڑائی جھگڑے تو صرف دن کی مصروفیت کا حصہ ہیں۔ ورنہ دادا اور دادی کی محبت تو مثال بن گئی ہے۔ پوری زندگی انہوں نے ایک دوسرے کے لیے قربانیاں دیتے گزار دی۔ دادی ذرا تیز تھیں، اور دادا نرم۔ اسی لیے اچھا گزارا ہوا۔ بیٹیوں کی جوانی میں موت کا اثر ان دونوں پر ہی بہت ہے۔ برداشت نہیں رہی اب۔ اس لیے بہانے بہانے سے لڑ بیٹھتے ہیں۔"

نانی کہہ رہی تھیں "کیوں۔ ثنا ہماری بچی ہے۔ ہم جس طرح چاہیں گے اس کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔ اس مردود سے کیا واسطہ ۔؟"

"بے شک وہ ہماری ہے، مگر وہ ابھی اکیس سال کی ہے۔ قانوناً سنِ بلوغت کو نہیں پہنچی۔ اگر کچھ دن صبر کر لو۔ تو یہ خطرے کے دن نکل جائیں گے۔"

"اونہہ ۔ خطرہ ۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ میں اپنی زندگی میں اسے محفوظ ہاتھوں میں دینا چاہتی ہوں۔ تاکہ وہ مضبوط ہو جائے۔"

"اور وہ خبیث مقدمہ کر کے، اگر مقصود حاصل کر لے۔ تب ۔" نانا کچھ سوچ رہے تھے شاید۔

"کر دے مقدمہ۔ دیکھنا ہے، کتنی ہمت ہے اس میں۔ آئے ایک بار۔ ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

"زبانی جمع خرچ۔ قانون وہ کام کر سکتا ہے۔ جو تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ وہ مردود ہر ذلیل سے ذلیل تر کمینے پن کا کام کر سکتا ہے۔ مگر وہ پہچان نہ پایا۔ تو کیا لے جائے گا۔"

"اس کے باوجود۔" نانا تحمل سے کہہ رہے تھے۔

"اس کے باوجود اپنا حق استعمال کر کے وہ سب کو حیران کر سکتا ہے۔ قانوناً وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے کا اختیار رکھتا ہے۔ مگر بائیس سال کی عمر کے بعد۔ لڑکی کی مرضی کے بغیر کچھ نہ کر پائے گا۔ اب سمجھیں۔ یا نہیں کس لیے مخالفت کر رہا ہوں۔ دو سال ٹھہر جاؤ۔ اس کی تعلیم مکمل ہونے دو۔ شادی بھی ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ جو بھی مقدمہ، معاملہ ہو۔ اسے ہم ہی ہینڈل کریں۔ دوسروں کو کیوں زحمت دی جائے۔"

"اب وہ آئے، اسے میرے پاس لانا۔ تم تو باہر ہی باہر کانفرنس کر کے رہ جاتے ہو۔ آیا تھا کہیں سے بن کر باپ۔ اسے اوقات یاد دلاؤں۔ کیا تھا وہ۔ اور ہمارے احسانوں کا کیا بدلہ دیا۔ اس کا سلوک۔ اس کی وہ زیادتیاں۔ وہ ظلم۔ کمینے منحوس کو موت بھی نہیں آتی۔ مر جاتا تو پاپ کٹتا۔ میری بچیاں۔ ہائے میری معصوم بچیاں۔" بے کلی اور صدمے سے بُرا حال تھا۔

"کیوں رات کے وقت گالی کوسنے دے رہی ہو۔ عقل سے کام لو۔"

"وہ تو دو سال کے دوران بھی کارروائی کر سکتا ہے۔ کیوں نہ ہم اس بچی کو اس کے حق داروں کے حوالے کر کے ۔ اپنا فرض ادا کر دیں۔" نانی سنبھل گئیں۔

"ایک تو میں تمہاری سیاست نہیں سمجھ سکا۔ جو کام کرتی ہو۔ فضول عقل سے خارج۔ اگر اسے شروع میں ہی بتا دیا جاتا کہ اس کا باپ زندہ ہے۔ موجود ہے تو یہ مسئلہ اتنا نہ اُلجھتا۔ تم نے پوشیدہ رکھنے پر ضد کر لی، آخر بن یا میں۔"

مگر نانا کی بات مکمل نہ ہو سکی۔ ثنا اب ہر راز جان چکی تھی۔ ایک پُر شور آواز کے ساتھ دروازہ کھول کر وہ اندر گھس آئی تھی۔ اور چیختے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"کہاں ہے میرا باپ؟ کون ہے میرا باپ؟"

آنسو برساتی نالے کی طرح اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے، اور جسم کپکپا رہا تھا۔

"بتائیں نانی ۔ میرے پاپا زندہ ہیں تو مجھ سے کیوں نہیں ملتے۔ آپ نے کہاں چھپایا ہے انہیں۔ نانا جی بتائیے ۔ میرے پاپا کون ہیں؟"

نانا نے اس کے کمزور وجود کو بانہوں میں تھام

لیا" بتاتے ہیں، بتاتے ہیں۔ تم بیٹھو تو۔ سنو تو۔"

مگر اس کے وجود میں ایک طوفان اُبل رہا تھا۔ بن پانی کے مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ بھنور میں گھری کشتی کی مانند۔ کبھی اِدھر گرتی۔ کبھی اُدھر لڑھکتی۔ آواز بھی آنسوؤں کے زور میں پھٹ گئی تھی، نانا کو بھی کبھی نانی کو۔ جواب کا انتظار کیے بغیر مسلسل سوال کیے جا رہی تھی۔

"کہاں چھپایا ہے انہیں آپ نے؟ بولیں۔ بتائیں؟"

پوری طاقت سے چلائی۔ گردن کی رگیں پھول گئیں، چہرے پر نیلی باریک رگیں اُبھر آئیں۔ آنسوؤں نے اس کی گردن بلکہ گریبان تک تر کر ڈالا۔

"ہم کیوں چھپاتے منحوس کو۔" نانی پر ذرا بھی اثر نہ تھا اس کی آہ و زاری کا۔ "خود ہی منہ چھپائے پھرتا ہے مردود۔"

"آپ دشمن ہیں میرے پاپا کی۔ مجھے کیوں نہیں بتایا۔ کہاں ہیں وہ؟ میں ان سے ملوں گی، میں جاؤں گی ان کے پاس۔ میرے پاپا! تم کہاں ہو؟"

غم و الم، محرومی اور شدتِ جذبات۔ وہ ایک طوفانی ریلے میں بہے جا رہی تھی۔ نہ اسے کچھ نظر آ رہا تھا۔ نہ وہ کچھ سن پا رہی تھی۔ بس وہ چیخے جا رہی تھی۔ پوری طاقت سے۔ اس کے پاس تو الفاظ بھی بہت کم تھے۔ اپنے دکھ، صدمے اور محرومیوں کے اظہار کے لیے۔

"کہاں ہیں میرے پاپا؟ کہاں ہیں وہ۔ میں جاؤں گی، میں جاؤں گی ان کے پاس۔ لے چلو مجھے۔"

چیختے چیختے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ سانس رُکنے لگا تھا۔ ہاتھ پیر شل ہو گئے تھے۔ وہ مسلسل اِدھر سے اُدھر گھوم رہی تھی۔ بڑے ماموں، مامی آ گئے، صبا، ہما اس کی چیخیں سن کر آ گئیں۔ وہ سب اسے سنبھالنے میں لگے تھے۔ وہ بپھری جا رہی تھی۔

"مجھے پاپا سے ملوا دو ظالمو! کیوں مجھے ان سے دور رکھا ہے! کیوں مجھے ان کے پاس نہیں جانے دیتے۔"

وہ اب بھی مچل رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا اس کو اپنے جذبات، اپنے ارادوں پہ قابو یا اختیار ہی نہیں رہا۔ وہ ایک دورے کی سی کیفیت میں تھی۔ سب نے اسے پکڑ کر زبردستی نانا کے پلنگ پر بٹھا دیا تھا۔ وہ ماموں، مامی سے بھی جواب مانگتی رہی۔ پھر اسے نانی نظر آئیں۔ اور وہ ان کے پلنگ پر جا گری۔ اور ان سے بھی رو رو کر سوال کرنے لگی تب دروازے میں بن یامین کھڑا نظر آیا۔ اس کی آنکھیں سرخ سرخ تھیں۔ وہ شاید ابھی سوتے سے اُٹھ کر آیا تھا۔

"باپ یاد آیا ہے خبر سے۔" نانی نے بن یامین کو مطلع کیا۔ ان کا لہجہ طنزیہ تھا۔

ثنا کو غصہ آ گیا۔ یہ بن یامین کون ہوتا ہے جس کو خصوصی طور پہ سنایا جا رہا ہے۔

"میں مقدمہ کروں گی۔ سب نے مجھ پر ظلم کیا ہے میرے پاپا کو۔" ہچکیوں کے زور میں بات بھی پوری نہ ہوئی۔ اور نانی نے چڑ کر کہا۔

"کر دے مقدمہ۔ پاگل خانی۔"

"ہاں۔ ہاں کروں گی۔ ضرور کروں گی۔ میرے پاپا کہاں ہیں، ماموں۔" بین کرنے لگی۔

"جا۔ ساری عمر۔ یہاں اس گھر میں گزار دی۔ اب بے دیکھے باپ کی چاہت اُبل پڑی۔"

"ہاں۔ نہیں رہوں گی اب اس گھر میں، کبھی نہیں جاؤں گی۔ ضرور جاؤں گی!" وہ پھر حلق پھاڑ کر چیخنے لگی۔ بن یامین کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ غراتا ہوا اندر آیا۔ زوردار تھپڑ رسید کر کے اسے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ اور اس کے کمرے میں لے جا کر پلنگ پر پٹخ کر دہاڑا۔

"اب آواز نکالی، تو جان نکال لوں گا۔ نانی سے بدتمیزی کرتی ہو۔ احسان فراموش۔"

اور فوراً ہی باہر نکل گیا۔ بن یامین کا تھپڑ۔ اس کا ہاتھ اتنا بھاری تھا کہ واقعی چودہ طبق روشن نہیں تاریک ہو گئے۔ آواز حلق کے اندر ہی بند ہو گئی۔ کس بیدردی سے گھسیٹتا ہوا لایا تھا۔ جنگلی۔ اذیت سے بے حال ہو گئی۔ چند منٹ بن یامین کے تھپڑ کی تکلیف سہتی رہی۔ رخسار جل اُٹھے تھے، مگر اَن دیکھے باپ کی چاہت دل میں لگی آگ کی جلن اسے پھر نانی کے کمرے میں لے آئی۔ آنسو تو سیلاب کی مانند سارے بند توڑ کر نکلے آ رہے تھے آنکھیں شعلوں میں بھسم ہوتی لگ رہی تھیں۔ دل میں ایک تڑپ تھی۔

Kausar56@ One Urdu .Com

بن یامین نانی کے پاس بیٹھا کہہ رہا تھا۔ "بھجوا دیں اس کو باپ کے گھر۔ یہی حل ہے۔"

نانی دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ "قہر ٹوٹے تجھ پر۔ زمین بھاری ہو جائے تیرے لیے۔ الٰہی۔ جیسے اس نے میرے دل کا چین اُجاڑا ہے۔ اس کا بھی چین برباد ہو۔ ہائے میرا دل۔"

وہ پلنگ پر گِر سی گئیں۔ بن یامین فوراً انہیں سہلانے اور سمجھانے لگا۔

"مجھے ابھی پاپا کے پاس بھجوا دیں۔ ابھی۔ ابھی۔"

ثنا آواز پر قابو پا کر بولی تھی۔ گو کہ سینے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ اور بس نہ چلتا تھا کہ سب کو نوچ کھسوٹ ڈالتی۔ اتنا عرصہ وہ خود کو یتیم لڑکی سمجھ کر خود پہ ترس کھاتی رہی تھی۔

"کیوں نہیں بتایا آپ نے، کہ میرا باپ زندہ ہے۔"

"نہیں بتایا۔ ہماری مرضی۔ مگر سُن بے لڑکی! تجھے اتنے دن پال پوس کر اب وہاں نہیں جانے دوں گی۔ بھیجنا ہوتا۔ تو دس برس پہلے پھنکوا دیتی۔ کلیجے سے لگا کر نہ رکھتی۔ مگر۔"

نانی کی آواز بھرا گئی۔

"اپنی معصوم، بے گناہ بیٹی کے قاتل کی خواہش کبھی نہ پوری ہونے دوں گی۔ وہ تیرے خون کا پیاسا خود غرض۔"

نانی ہانپنے لگیں۔ انتہائے غیض میں وہ یوں ہی ہانپا کرتی تھیں۔

"اس دن کے لیے پال پوس کر جوان کیا تھا۔ ارے سنپولیے کو دودھ پلا رہی ہوں، یہ جانتی تو خود ہی گلا دبا دیتی۔"

نانی کی آواز دوسرے کمرے تک آ رہی تھی۔ جہاں مامی اور صبا اسے پکڑ لائی تھیں۔

"پالنے کا طعنہ دے رہی ہیں اُسنا آپ نے مامی۔"

وہ ہچکیوں کی زد میں تھی۔

ماموں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ اسے آرام کرنے کی تلقین کی، اور اپنی ماں کے پاس چلے گئے۔ جو بے حد مضطرب تھیں، حالانکہ ان کا لاڈلا بن یامین ان کے پاس تھا۔ جوان کی خدمت کر رہا تھا۔ لیکن انہیں اختر بہت یاد آ رہا تھا۔

"میرا اختر ہوتا تو یہ سب ایسے نہ ہوا ہوتا۔"

"سُنو ثنا! تمہیں یاد ہے۔" مامی اسے گلے لگائے بڑے پیار سے اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتی ہوئی آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں۔

"جب ابا جان نے تم لڑکیوں کو ڈرائنگ روم میں بلایا تھا۔ جہاں دو آدمی بیٹھے تھے۔" ثنا نے اثبات میں گردن ہلائی۔ وہ ابھی تک ہچکیوں پر قابو نہ پا سکی تھی، حالانکہ ہما نے پانی پلایا۔ صبا گلوکوز دودھ میں ملا کر لائی تھی، جو اسے زبردستی پلایا گیا۔ مگر اب بھی ہر سیکنڈ کے خاتمے پر ہچکی سے اس کا بدن ہل جاتا تھا۔

"ان میں سے ایک تمہارے پاپا تھے۔ وہ۔ جنہوں نے شنی کو کالی کہہ کر اپنی بیٹی ماننے سے انکار کیا تھا۔ اور ہما کو بیٹی مانا۔ ان کے اصرار پر ابا جان نے یہ طے کیا تھا کہ وہ آ کر اپنی بیٹی کو پہچان لیں، اور لے جائیں۔ دوسرے صاحب کو ابا جان نے خود بطور گواہ بلایا تھا۔ جو تمہیں پہچانتے تھے۔ مگر۔ وہ تمہیں نہیں پہچان سکے، جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ انہوں نے کبھی تمہیں دیکھا ہی نہیں تھا۔ اور وہ اس لیے۔ کہ انہیں تم سے نفرت تھی، تمہاری پیدائش کے ساتھ ہی وہ تم سے بیزار ہو گئے تھے۔"

مامی کہہ رہی تھیں۔ تو وہ۔ ہونق صورت والے جو کسی مجرم کی شناخت پریڈ جیسی تفتیش کر رہے تھے۔ اس کے پاپا تھے۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ کیوں نفرت کریں گے۔ ایک باپ اپنی بیٹی سے نفرت کرے۔ کیسے۔"

"ثنا۔ میری جان۔ یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ آخر اب سے پہلے۔ انہیں تمہارا کیوں خیال نہ آیا؟ کبھی تم نے سوچا۔؟"

"آپ سب نے چھپایا تھا اس بات کو۔" ہچکیوں کے ساتھ اس نے روتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو۔ میں تمہیں بتاتی ہوں، تمہاری ماں حور بانو۔ بے حد نرم و نازک احساسات کی مالک تھی۔ وہ سب سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی۔ قربانی، ایثار۔ خدمت فرماں برداری اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ مگر اس کی اتنی خوبیوں کی تمہارے باپ نے قدر نہ کی۔"

"یہ۔ یہ تو آپ کہہ رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے غلط ہو۔" باپ کے متعلق کوئی بُری بات سننے کو تیار نہ تھی وہ۔

"وہ بہت زیادہ شرم و حیا والی تھی۔ نیک اور معصوم

وہ ان الزامات کو نہ سہہ سکی۔ جو تمہارا باپ اس کے کردار کو داغدار کرنے کے لیے لگاتا تھا۔ اور شاید۔ زبانی الزام وہ۔ سہہ لیتی۔ لیکن جسمانی ایذا۔ اور روحانی اذیت برداشت نہ کر سکی۔ جب تم پیدا ہوئیں، اسے تم سے نفرت ہو گئی۔ تمہارے حوالے سے وہ اسے طرح طرح سے تکلیف پہنچاتا تھا۔ وہ اذیت پسند ہے، اور تمہاری ماں۔ سب کچھ برداشت کر کر کے، بیمار ہو گئی۔ وہ ہمیں کچھ بتاتی نہیں تھی۔ کہ ہم شرمندہ نہ ہوں۔ وہ ماں باپ کی خواہش پر قربان ہو گئی۔"

مامی کی آواز میں غم کی کسک تھی۔ وہ آبدیدہ ہو گئیں۔

"ہم نے تو اس شادی کی بہت مخالفت کی تھی۔ کیونکہ حور بانو کی نسبت طے ہو چکی تھی۔ بڑے ارمانوں آرزوؤں سے ہم نے حوری کی منگنی کی تھی۔ اور شادی ہونے ہی والی تھی۔ مگر۔ وہ اچانک اپنے بیٹے کو لے کر آ گیا۔ اس نے حوری کی منگنی کا سُن لیا تھا۔ پھر بھی۔ اماں جان سے اس نے کہا کہ کیا میرا بیٹا سوتیلی ماں کے رحم و کرم پہ ہو گا۔ میں کس طرح اسے پالوں۔ دفتر جاؤں، گھر کے کام کروں۔ اور بیٹے کو بھی دیکھوں۔

میں نے تو ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ کہ وہ بچے کو ہمارے حوالے کر دے، مگر اس نے بچے سے اپنی محبت اور اس کی مرحومہ ماں سے تعلق کا بہانا کر کے چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اور اماں جان سے کہا۔ کہ خالہ ہی بھانجے کو ماں کی محبت دے سکتی ہے۔ اور یوں۔ اماں جان نے حوری سے اس بچے کی خاطر قربانی طلب کی، جو اس معصوم نے ماں باپ اور بچے کے لیے دے دی۔ منگنی توڑ دی گئی، اور محبت کا وہ چمن اُجڑ گیا۔ حور بانو اس ظالم کے حوالے کر دی گئی۔ کہ وہ بچے کو ماں کی ممتا دے۔ وہ ظالم ہی نہیں۔ بے حس اور سنگدل بھی تھا۔ پہلے وہ بچے کے بہانے اسے مارتا پیٹتا کہ وہ اس کا خیال نہیں کرتی۔ پھر اس پہ خیالوں میں گم رہنے۔ اور کسی کی یاد میں کھونے کا الزام لگا کر سختیاں کرنے لگا۔ اس نے دن رات حور بانو پہ ستم ڈھائے۔ اس کی شرم و حیا۔ اس کی نرمی، نازکی کا خیال نہ کیا، سختیاں، پابندیاں، طعنے مار پیٹ۔ کیا نہ کیا اس نے حور بانو تو ایک نازک سی کلی تھی، مُرجھا گئی۔"

مامی اب آنسو بہا رہی تھیں۔ اور ساتھ میں صبا اور ہما بھی رو رہی تھیں۔ ثنا کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اور وہ حیرت سے اپنے باپ کے کارنامے سُن رہی تھی۔

"اور میں۔ اور وہ بچہ۔"

"تم پیدا ہوئیں۔ تو اُسے تم سے نفرت ہو گئی۔ وہ کہتا تھا تم نے اپنے محبوب کی یاد میں یہ دن گزارے ہیں۔ اسی کے تصور میں کھوئی رہتی تھیں۔ یہ بچی اسی لیے میری نہیں لگتی۔ یہ میری نہیں۔ اس کا روحانی باپ فیضان ہے۔ جاؤ۔ اس کو اسی کی گود میں جا کر ڈال آؤ۔ وہی اسے پالے۔ میرے لیے یہ ناگن ہے۔ میں ناگن کا وجود اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"فیضان۔" ثنا جو مامی کی گود میں لیٹی تھی۔ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اضطراری طور پر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں فیضی۔ فیضی سے حور بانو کی منگنی چار سال رہی تھی۔ وہ اعلا تعلیم کے لیے امریکہ گیا ہوا تھا۔ اس کی واپسی کے دن قریب تھے۔ گھر میں شادی کی تیاری شروع ہو گئی تھی، تب۔ یہ سانحہ ہوا۔ منگنی توڑ دی گئی۔ اماں جان نے معذرت کر لی۔ اور حور بانو کو اس کی مرحومہ بہن کے بچے کی ذمہ داری سونپنے کے لیے اس بے قدر بے ضمیر آدمی کے حوالے کر دیا گیا۔ میں اس شادی میں شریک نہیں، ہوتی۔ میرا دل اس ظلم پہ احتجاج کر رہا تھا۔ میں نے فیضان کے لیے اماں جان سے کتنی خوشامدیں کی تھیں۔ ان سے فیضی کی زندگی کی بھیک مانگی تھی۔ مجھے یقین تھا۔ وہ یہ سُن کر۔ کہ اس کی محبت کسی دوسرے کے سپرد کی جا رہی ہے۔ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ مگر میری بات کسی نے نہیں مانی۔ مجھے تو یقین تھا۔ حوری بھی اس کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ مگر اس نے تو اپنی طاقت سے کہیں زیادہ مظالم سہہ لیے۔"

"اور۔ وہ بچہ۔"

"وہ بچہ۔ اس کی ماں بھی تو حوری کی بہن تھی۔ ویسی ہی نیک سرشت۔ ماں باپ کی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے، شوہر کے ظلم و ستم کی کہانی کسی پہ ظاہر نہ کر سکی۔ خود جبر کی چکی میں پستی رہی اور کسی کو خبر نہ ہونے دی۔ کاش، وہ خود پر ہونے والی زیادتیاں کسی سے تو کہہ دیتی۔ حور بانو بچ جاتی۔ مگر، بڑی بہن کے مرتے ہی چھوٹی کا شکار کرنے آ پہنچا۔ اور۔ شکرے سے کون بلبل بچی ہے۔"

جب حور بانو لحد گور ہو گئی۔ تو [illegible]

سے آئے تھے۔ بہن کو بُلا بُلا کر تھک گئے۔ تب اس سے ملنے خود جا پہنچے۔ اس کی حالت پر انہیں سکتہ ہو گیا تھا۔ اس کو علاج کے لیے وہ لندن لے گئے۔ مگر اس کے احساسات زخمی تھے۔ نرم و حساس دل لہولہان ہو چکا تھا۔ زندگی کی خواہش ہی نہیں رہی تھی۔ محبت سے اعتبار اُٹھ جائے تو زندگی ممکن ہے۔ مگر جب خود پر ہی بھروسا نہ رہے تو کوئی کیسے جیے۔ حور بانو نے اتنے صدمے اُٹھائے۔ اتنے دُکھ سہے۔ ایسی ایسی اذیتیں برداشت کیں۔ جن پر انسانیت نادم ہو گئی ہو گی۔ جینے کی آرزو ہی باقی نہ رہی۔ اس نے محبت کی قربانی دے کر جس ممتا کے لیے کانٹوں بھرا راستہ چُنا۔ وہ قربانی رائیگاں گئی۔ تب سے آج تک۔ اس باپ نے تمہاری صورت نہیں دیکھی، جس کے لیے تم دو گھنٹے سے قیامت برپا کیے ہو۔ ثنا جس کی دو بیٹیاں ایک دیو کا لقمہ بن چکی ہوں، ان والدین کے احساسات۔ اتنے ہی زخمی ہوں گے۔ بلکہ زیادہ — امّاں جان، ابّا جان نے تو بہت صبر سے کام لیا ہے۔ قسمت کے بجائے خود کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں، ورنہ اب جو اس نے تمہاری واپسی کا مطالبہ کیا ہے تو ابّا جان نے یہی کہا۔ کہ پہچان لو۔ اور لے جاؤ۔ مگر — وہ کیسے پہچانے؟

"میں نانی کے پاس جاتی ہوں۔" ثنا نے پلنگ سے چھلانگ لگائی۔ اور ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی نانی کے کمرے میں جا پہنچی — وہ ان کی گود میں گر کر سسکنے لگی۔ وہ خود بھی رو رہی تھیں۔ اور اپنے خدا سے فریادیں کر رہی تھیں۔

"میری حور بانو کی نشانی۔ میری جان۔ کیسے کیسے چاند چہروں۔ اور کیسی حور پریوں کو اس ظالم کے اوپر قربان کر دیا۔ ہائے میری چاند جیسی نور کو مار ڈالا ظالم نے۔ پھر حُور کو نشانہ بنایا۔ کس سے کہوں۔"

"امّاں صبر کریں —" ماموں اپنی ماں کو بازوؤں کے گھیرے میں لے کر بیٹھ گئے۔

نانا جا نماز بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔ تہجد کا وقت ہو چکا تھا۔

بن یامین بھی نانی کے بستر کو درست کرنے لگا، اور انہیں تسلی دیتا رہا۔

ثنا نانا کے نماز پڑھتے ہی ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

"نانا جی! میں آپ کی حُور بانو ہوں۔ مجھے حُور بانو سمجھ لیں۔"

نانا کی آنکھیں بھیگی بھیگی تھیں۔ انہوں نے کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا۔ اور اس کے چہرے کو ہاتھ میں لے کر دُعا کی۔

"خدا تمہیں ہر بلا سے بچائے، میری حُور بانو۔"

پھر انہوں نے نانی کے ہاتھ دباتے بن یامین کو پکارا۔

"ادھر آؤ بیٹا!" وہ آیا تو بولے۔

"آج اس بہن کے سر پہ ہاتھ رکھ کر وعدا کرو۔ کہ کبھی اسے باپ کی کمی کا احساس نہ ہونے دو گے۔ بیٹا! بڑا بھائی بھی باپ برابر ہوتا ہے، تم نے کبھی اپنی بہن کے سر پہ ہاتھ نہیں رکھا۔ اس کے دُکھ کا احساس نہیں کیا۔ ورنہ آج اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔ اسے اپنی محبت اور تحفظ کا یقین دو۔"

ثنا حیرت سے نانا کو دیکھ رہی تھی۔ یہ نانا جی کیا کر رہے ہیں۔

نہ جانے بن یامین پہ کوئی بوجھ تھا۔ یا وہ اپنا رویّہ یاد کر کے نادم تھا۔ فوراً نیچے بیٹھ گیا تھا۔ اور اس نے اپنا بھاری ہاتھ ثنا کے سر پہ رکھ کر نانا سے کہا۔

"نانا! آپ کا حکم ہے، اس لیے عہد کرتا ہوں۔"

"بیٹا! تمہارا فرض ہے، اس کو گلے لگا کر دل سے شکوہ دور کرو۔"

بن یامین نے بے تابی سے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ اور بار بار اس کے سر پہ بوسے دیتا رہا۔ اس کے مضبوط بازوؤں کی پناہ کسی آہنی قلعے سے کم نہ تھی۔ بن یامین کا گلا رندھ گیا۔

ثنا بے خودی کی حالت میں تھی۔ بن یامین۔ اس کا ماں جایا نہ سہی۔ بھائی تھا۔ بڑا بھائی۔

"تم نے اس معصوم کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا کبھی۔"

"جی۔ مجھے خیال آتا تھا کہ خالہ کی موت کا سبب یہی تھی۔ نانا۔ اگر یہ پیدا نہ ہوتی۔ خالہ نہ مرتیں۔ میں انہیں مرنے نہ دیتا مگر —"

"بیٹا! کفر نہیں بکتے۔ توبہ کرو۔ ہر بندہ اپنے وقت پہ جاتا ہے۔"

بن یامین نے ثنا کو زور سے لپٹا لیا، اور اس کے سر

پہ منہ رکھ کر رونے لگا۔ اس کا لمبا چوڑا جسم ہچکیوں سے ہلنے لگا۔

ماموں نے اسے آ کر اٹھایا۔ "بن یامین۔ مرد ہو کر روتے ہو۔"

"ماموں جان! میں آج تک نہیں رویا۔ پہلی بار اپنی پیاری خالہ کے لیے رو رہا ہوں۔ مجھے ان کا ماتم کرنے دیں۔"

اس کی آواز پھنس گئی، اور پھر ثنا نے بھی زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ تو مامی، صبا، ہما دوڑی آئیں۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے لپٹے یوں رو رہے تھے جیسے حور بانو کا جنازہ سامنے رکھا ہو۔ اور انہیں روتے دیکھ کر نانی بھی ضبط کھو بیٹھیں۔ سب آبدیدہ ہو گئے۔

"چلو بیٹا! صبح ہونے والی ہے۔ اب جا کر سو جاؤ۔" مامی آنسو پونچھ کر بولیں۔

انہوں نے بن یامین اور ثنا کو الگ کیا۔ زبردستی بن یامین کو اوپر بھیجا۔ اور ساس سے کہا۔

"امّاں جان! اب آپ بھی آرام کریں۔ اور اس کہانی کو اب یہیں دفن کر دیں۔ ہمارے سامنے ثنا اور بن یامین ہیں۔ نور بانو اور حور کی نشانیاں، شکر ہے خدا کا جس نے صبر کے پھل عطا کیے ہیں۔ ہما۔ بیٹا ثنا کو لے جاؤ۔ اور اس کا منہ ہاتھ دھلواؤ۔"

مامی کے احکام کے ساتھ ہی سب کمرے سے نکل گئیں۔ مگر ماموں اور مامی نانی کے پاس کافی دیر تک بیٹھے رہے۔

ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ رات دیر تک جاگنے اور رونے کے باوجود صبح سویرے سب کی آنکھ کھل گئی تھی۔ سوائے ہما کے۔ جو آج بھی خواب میں کسی سے جھگڑ رہی تھی کہ اس نے جو امرود توڑا تھا وہ کہاں گیا۔

بن یامین اوپر سے اُتر رہا تھا۔ تو ثنا کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ نہ جانے ایک رات میں ہی کیا انقلاب آیا تھا۔ کہ بن یامین اسے ساری دنیا کے مردوں سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ میرا بھائی — بڑی طاقت تھی ان لفظوں میں — میرا بڑا بھائی — بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ وہ آج وہ بھی فخر کر سکتی تھی۔ دنیا کس قدر ہیچ نظر آ رہی تھی۔ اور جب وہ اس کے پاس آ کر بیٹھا، ایک عالم گویا اس کے ساتھ تھا۔

بن یامین کی بھی کایا پلٹ ہو گئی تھی، اسے بھی اپنی یہ پیاری سی بہن سارے جہان سے زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ اس کی نظریں ثنا کے چہرے کا طواف کرتے تھکتی نہ تھیں۔ جن آنکھوں میں نفرت اور بے زاری کے شعلے برستے تھے۔ اب انہی آنکھوں سے پیار اور شفقت کی پھوار برس رہی تھی۔ ثنا نے اس کی کمر کے گرد بازو ڈال دیے۔

"بھائی — بھائی جان۔"

بن یامین نے فوراً اس کی پیار بھری پکار کا جواب دیا۔ اس کو اور قریب کر لیا۔

"ہاں۔ میری ننھی بہن!"

"بھائی جان! آپ مجھ سے اس لیے خفا تھے کہ۔"

"کہ تمہارے پیدا ہونے کے بعد — خالہ جانی مجھ سے بچھڑ گئیں۔ پہلے ماموں انہیں یہاں سے لے گئے۔ پھر وہ دنیا سے چلی گئیں۔ میرا سب کچھ لُٹ گیا۔ اپنی ماں کو تو میں بھلا چکا تھا۔ خالہ نے اتنی محبت دی۔ اتنا پیار۔ کہ شاید میری امی ہوتیں تو کبھی تو میری شرارتوں یا بچپن کی بدتمیزی پہ مجھے سرزنش کرتیں۔ مگر خالہ — خالہ نے اپنا وعدا نبھایا۔ اپنا تن من وار دیا۔ میرے سر کا سایا۔ میری تمناؤں کا سنگم بن گئیں۔"

"بھائی — وہ کیسی تھیں؟" وفورِ جذبات سے ثنا کا گلا رندھ گیا۔

"حسین ترین حوروں کو مات دینے والا حُسن۔ اور فرشتوں جیسی معصومیت ثنا! تم میری خالہ کا عکس ہو۔ مگر یوں جیسے گدلے پانی میں کوئی چاند کو دیکھے۔ وہ تو اتنی شفاف اور پاکیزہ تھیں۔ ان کی آنکھوں سے ان کے کردار کی تقدیس اور دل کے صاف آئینے کا پتا چل جاتا تھا۔ محبت اور ایثار سے گندھی ہوئی۔ پتا نہیں میرے باپ کو ان میں وہ خوبیاں کیوں نظر نہیں آئیں۔ جو میں اپنے بچپن میں ہی دیکھتا رہا۔ جب ابّا انہیں گالیاں دیتے۔ اور ان پر طنز کرتے، الزام لگاتے۔ وہ مجھ سے بھی شرما جاتیں۔ اور کمرے میں جا کر رونے لگتیں۔ میں انہیں پیار کرتا، اور ابّا کی مار سے انہیں

Kausar56@ One Urdu .Com

بچانے کے لیے ان پہ لیٹ جاتا۔ یا ابا کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ تو۔ میری بھی پٹائی ہوتی۔ صرف اس لیے کہ کہیں میں نانا یا نانی سے شکایت نہ کر دوں۔ ابا نے خالہ کے ساتھ میرا بھی یہاں آنا بند کر دیا۔"

بن یامین ماضی میں کھو چکا تھا، اور اسے یہ خیال بھی نہ رہا کہ ثنا اس سے ماں کی سیرت اور صورت جاننے کی فرمائش کر رہی ہے۔ ان پر کیے گئے مظالم کی تفصیل جاننا نہیں چاہتی۔ جس کے سننے سے ہی وہ اپنے اس باپ سے نفرت پر مجبور ہو گئی تھی۔ جس کی کمی۔ اور جس کی شفقت وہ دوسروں میں تلاش کرتی رہی۔

"میری خاطر۔ صرف میری خاطر۔ خالہ سب کچھ برداشت کرتی رہیں۔ ورنہ میں نے انہیں کئی بار کہا۔ خالہ آپ نانی کو لکھیں۔ آپ یہاں سے چلی جائیں۔ مگر وہ مجھے لپٹا کر رونے لگتیں، کہتیں کہ میرے چاند۔ تجھے چھوڑ کر تو میں دنیا سے بھی نہیں جاؤں گی۔ ورنہ۔ موت مانگ لیتی۔ خدا میری دعا ضرور سنتا۔ اور تمہارے پیدا ہونے کے بعد۔ جو کچھ انہوں نے سہا۔ نہ جانے کیوں مرنے کی دعا مانگی۔ وہ تو مجھے چھوڑ کر نانی کے گھر نہیں جاتی تھیں۔ تمہیں چھوڑ دنیا سے ہی چلی گئیں۔"

بن یامین ایک جذب کے عالم میں بول رہا تھا اور ثنا سر اٹھائے اس کی ان آنکھوں میں محبت۔ نفرت، حقارت کو آنسوؤں میں لپٹے دیکھ رہی تھی۔

ماحول سوگوار ہو گیا تھا۔ ثنا بے آواز آنسوؤں سے اپنی مری ہوئی ماں کا ماتم کر رہی تھی۔

"بھائی۔ اور پاپا۔ کیسے ہیں۔" آنسو پونچھ کر آخر دل کی بات زبان پہ آ ہی گئی۔

"جیسے ایک ظالم جادوگر ہوتا ہے۔ آج تک میں نے ان میں تبدیلی نہیں دیکھی۔ شاید اس لیے۔ کہ میں نے نانا، نانی کو وہ ساری داستانِ الم کہہ سنائی تھی۔ جو خالہ پر بیت گئی۔ مگر دیر ہو چکی تھی۔ خالہ لندن کے ہاسپٹل میں ختم ہو چکی تھیں۔ میں نے جب سنا تو۔ ابا کو مارا۔ دانتوں سے کاٹا، انہوں نے مجھے کمرے میں بند کر دیا۔ اور تیسری بیوی کو گھر لے آئے۔ جس نے۔ خیر۔ اس بچاری کا کیا قصور۔ جب باپ ہی محبت سے ناآشنا ہو۔ تو کسی غیر سے کیا شکایت۔ اسکول سے بھاگ کر اسٹیشن پہنچا۔ اور۔ بغیر ٹکٹ ٹرین سے سفر کر کے نانا کے پاس آ گیا۔ تب سے۔ یہیں ہوں۔"

"بھائی۔ ایسی داستان۔ ہم کہانیوں میں پڑھتے ہیں۔ فلموں میں دیکھتے ہیں۔ اور یقین نہیں کرتے۔ مگر۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے۔ وہی کہانیاں بنتی ہیں۔ اسی سے فلموں کا خمیر آباد ہوتا ہے۔"

بیس سالوں میں جس داستان پر پردہ پڑا رہا۔ وہ اب۔ اتر گیا تھا۔ مگر ابھی بھی۔ کتنی ہی باتیں تھیں، جو سب اپنے دلوں کے خفیہ گوشوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ اور دردناک کہانی، المناک داستان میں گم ہو کر اپنی ماں کی حسرت انگیز زندگی اور حسرت آمیز موت کے لمحات کو سوچتے سوچتے وہ محبت کے اس کردار پر غور کرنے لگی۔ لیلےٰ مجنوں، سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا۔ گو کہ اب یہ داستانیں۔ قصوں میں کہانیوں میں ہی رہ گئی ہیں۔ اب لیلےٰ مجنوں پیدا ہوتے ہیں۔ مشہور نہیں ہوتے۔

حسب روایت۔ رات کے ان واقعات کا چرچا بھی ہو ہی گیا۔ سب اس کے پاس آ کر جمع ہو گئے۔ خالہ امی بھی آ گئیں۔ اور ثنا کو گلے لگا کر اس طرح روئیں جیسے خود بانو کی موت ابھی ابھی واقع ہوئی ہے۔ اور جنازہ صحن میں رکھا ہے۔ تینوں ماموں اسے لپٹا کر پیار کرتے رہے۔ خالہ امی نے کہا۔

"میں تو پہلے ہی رو چکی تھی۔ مگر بیٹی۔ جب سے تم آئی ہو، تمہیں دیکھ دیکھ کر اندر اندر گھٹتی رہی۔ ایک لفظ زبان سے نہ نکالا۔ اماں کا حکم تھا۔ "ثنا سے کچھ نہ کہا جائے۔""

لوگوں کے مجمع میں اکرم بھی تھا۔ آذر بھی۔ تینوں ممانیاں بھی۔ آنٹی فیضی بھی اسے تسلی دے چکی تھیں۔ مگر سب کے جانے کے بعد۔ مجمع کے چھٹنے کے بعد فیضی آئے۔ تو ثنا خود پر قابو نہ پا سکی۔ انہوں نے بھی اسے بے تابی سے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ اور وہ ان کے شفیق سینے پہ سر رکھے سسکیاں بھرنے لگی۔ اتنے آنسو وہ بہا چکی تھی۔ کہ اب آنکھیں خشک ہو چلی تھیں۔ پھر بھی فیضان کے قرب میں اسے اپنی ماں کی ناکام محبت کی مہک آ رہی تھی۔ خود بانو کی روح قریب ہی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ثنا اپنی ماں کی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔ وہ۔ جو فیضان کے دل میں آج تک زندہ و پائندہ تھی۔ یقیناً بے مثال ہو گی۔

"انکل آپ۔ آپ میرے پاپا کیوں نہ بنے۔" اچانک اس کے منہ سے نکلا۔

اور فیضی کی اس کے بالوں میں سرسراتی انگلیاں تھم گئیں۔ لمحے بھر کو جیسے وقت کی رفتار تھم گئی۔ فیضی ساکت ہو گئے۔ ثنا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ بھی جھک کر اسے دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نہ جانے کسی درد کا اثر تھا۔ یا صدمے کا زوردار حملہ۔ پھر وہ آہستہ سے بولے۔

"تم میری بیٹی ہی تو ہو۔ آج بھی۔" یوں لگا جیسے کوئی تنکا آنکھوں میں چبھ گیا ہو۔ وہ انگلی سے آنکھیں مسلنے لگے۔

"مگر۔ وہ تو آپ سمجھتے ہیں۔ ہوں تو نہیں میں آپ کی۔ کوئی بھی۔"

"بیٹا! ہم قدرت سے ہار جاتے ہیں۔ ہارتے رہتے ہیں۔ اور صبر کرتے ہیں۔ یہ صبر ہی ہے کوئی نہ کوئی میٹھا پھل عطا کرتا ہے۔ پھل تم بھی ہو۔ فروٹ۔" وہ اپنے غم کو بہلا رہے تھے۔ ہلکا سا تبسم ان کی آنکھوں کو چمک دے رہا تھا۔

"تم جیسا فروٹ کتنا میٹھا، اور تر و تازہ۔" انہوں نے پھر آنکھیں مسلیں۔

"تم۔ اپنی ماں کا دوسرا روپ ہو یقیناً۔ خدا تمہیں۔"

ان سے کچھ نہ کہا گیا۔ جلدی سے اس کے وجود کو خود سے چھڑا کر باہر چلے گئے۔ نہ جانے وہ کیا کہنے والے تھے۔ ان کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے تھے۔

ایک روشن مگر غمناک دن۔ ختم ہوا۔ تو بہت سے بوجھ اتر گئے تھے۔

بن یامین صبح صبح آ گیا۔

"ابا آئے ہیں۔ وہ تمہیں لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ مقدمہ کرنے کو کہتے تھے۔ نانا نے کہا۔ لے جاؤ، چلو۔ مل لو۔"

اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ اور ثنا کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے۔ سوچا۔ بعض ماں باپ اولاد سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ پاپا بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ بیوی کے لیے ہوں گے ظالم۔ مگر اولاد۔ اولاد کے لیے تو لوہے کے دل والا بندہ بھی۔ موم بن جاتا ہے۔ اور پھر اس گھر سے کبھی تو جانا ہی تھا۔ اپنی محبت وہ ہما کو بخش چکی ہے۔ پھر کیا فکر۔ اب مضبوط کرنا ہے اپنا دل اعصاب۔ اور ارادے۔ چلو باپ کے گھر کا لطف بھی دیکھ لیں۔

بن یامین اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ جہاں ایک اجنبی اس کا منتظر تھا۔ عرصہ پہلے وہ اسے دیکھ چکی تھی۔ بغیر کسی تعلق یا واسطے کے۔ اور اس دن اس شخص کے تفتیشی انداز پہ ہنسی بھی آ رہی تھی۔ اس لیے شکل ذہن میں محفوظ نہ رہی تھی، آج اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اجنبی نے۔ جو ان دونوں کا باپ تھا۔ انہیں بغور دیکھا۔

"ہوں۔ تو تم ہو ثنا۔" اس کے منہ سے غراہٹ سے ملتی جلتی آواز نکلی۔ (یقیناً یہ آواز، یہ غراہٹ بن یامین کو ورثے میں ملی ہے) اس آواز میں کوئی جذبہ نہ تھا۔ سرد اور بے جان لہجہ۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ بتایا ہو گا اس نے۔" انہوں نے بن یامین کی سمت اشارہ کیا جو ثنا کو تھامے کھڑا تھا۔ ورنہ شوق۔ جوش۔ اور اشتیاق کی ماری ثنا گر چکی ہوتی۔

"اب تک اس گھر والوں نے تم کو رکھا۔ اب میری باری ہے۔"

لہجہ بالکل کھردرا اور بیزاری لیے ہوئے تھا۔ گویا وہ کوئی چیز ہے جو باری باری استعمال کی جا سکتی ہے۔

نہ بیٹی کو گلے لگانے کی کوشش۔ نہ سر پہ محبت بھرا ہاتھ۔ نہ چہرے پہ خوشی کی رمق۔ ثنا کا حلق خشک ہو گیا۔

"ابھی میں آیا۔ تو لان میں کسی کو ٹہلتے دیکھا۔ وہ کیا کر رہا ہے یہاں۔"

"وہ۔ بڑی مامی کے بھائی ہیں۔" بن یامین نے فیضان کی اہمیت جتائی۔

"ہوں۔ اس نے ابھی تک اس گھر کا [illegible] چھوڑا۔ میں سمجھتا تھا دنیا چھوڑ [illegible]

پیچھے جانا چاہیے تھا اسے" قہہ۔ قہہ۔ وہ ہنسے "میں نے خاصی چوٹ دی تھی"۔ قہہ قہہ قہہ "تو تم چل رہی ہو؟"

پھر ثنا سے پوچھا۔ اور وہ صوفہ پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"ابھی تو۔ تیاری نہیں کی۔ میں۔ بھائی کے ساتھ آجاؤں گی۔"

اس کے منہ سے بے ساختہ یہی جملہ نکلا۔ حالانکہ وہ ساتھ جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔

"ٹھیک ہے" کھردرا آدمی کھڑا ہو گیا۔ "میں دو ہفتے کے لیے بنکاک جا رہا ہوں۔ واپس آؤں۔ تو تم گھر پہ ملنا۔ میرے گھر۔ اپنے گھر۔"

ثنا بیٹھی رہی۔ منتظر نظروں سے دیکھتی رہی۔ اب تو وہ سر پہ ہاتھ رکھنے۔ گلے لگانے آجائیں گے۔

"ویسے تم۔ اپنی ماں سے مختلف ہو۔" پہلی بار اس نے یہ رائے دی تھی۔

"اور مجھے۔ تیز طرار لڑکیاں پسند نہیں۔ خیر۔ ٹھیک کر لیں گے۔"

بن یامین کو مخاطب کیے بغیر۔ ثنا کو چھوٹے بنا۔ وہ باپ کمرے سے نکل گیا۔ جس کے لیے اس نے دو دن پہلے آنسوؤں کے سمندر تیار کیے تھے۔

کہاں تھا وہ باپ کا پُر شفقت ہاتھ۔ کدھر ہے وہ مہربان سینہ جس کی حرارت میں تحفظ ہے' اور کیسا ہوتا ہے وہ بابل کا سائبان۔ جس کی کہانیاں پڑھی جاتی ہیں اگیت گائے جاتے ہیں۔

پتھر کی طرح منجمد ہونا کسے کہتے ہیں۔ بن یامین نے زور لگا کر اسے اٹھایا تھا۔

"یہ کون۔ تھا۔؟" تھرتھراتے ہونٹوں سے نکلا تھا۔

"یہ ہمارے والدِ بزرگوار تھے جو بیویوں کے ساتھ اولاد کو بھی دفن کر دیتے ہیں۔"

بن یامین تلخی سے بھرا تھا۔ تو یہ وجہ تھی اس کے کڑوے پن کی۔ اس کے ساتھ باپ کا سلوک۔ ایسا ہی خشک بے جان کھردرا اور ظالمانہ تھا۔ اور وہ تو عرصے سے اس سلوک کو بھگت رہا تھا۔ صبا نے بتایا تھا کہ وہ جب غائب ہوتا ہے' تو باپ کے بلاوے پر جاتا ہے۔ (سعادت مند اولاد) اور جلا بھنا آگ میں تپا آتا ہے۔

یہ تو دادا/دادی کی تربیت کا اثر ہے کہ وہ کسی بری راہ کے مسافر نہیں بنے۔ دادی نے اتنی محبت دی کہ بگڑے نہیں ورنہ ایسے محروم توجہ بچے عموماً انتقاماً بری صحبت میں پڑ جاتے ہیں۔"

صبا نے ٹھیک کہا تھا۔ کتنی پہیلیاں تھیں۔ اور کتنے راز۔ جو رفتہ رفتہ اس پر کھل رہے تھے۔ کتنی ان کہی کہانیاں ابھی افشا ہوں گی۔ زندگی۔ تو کیسا سربستہ راز ہے۔ محبت، نفرت، انتقام، بے نیازی، بے حسی سب کچھ تو ہوتا ہے تیرے اندر۔

"اس سے تو ہم یتیم ہی ہوتے!" اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔

نانی کے پاس آ کر اس کی خشک آنکھیں پھر برسنے لگیں۔

"اب نہ رو بچی۔ اب رونے کی ضرورت نہیں۔" نانی اسے پیار سے کہہ رہی تھیں۔

"وہ۔ وہ۔ مجھے۔ لے جانے کا کہہ رہے ہیں۔ وہ۔ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔"

"جو بن یامین کے ساتھ کرتے ہیں۔ ماں اور خالہ کے جرم گنواتے ہیں۔ ہر دم، ہر لمحہ ان پر گناہوں کے دروازے کھولتے ہیں۔ وہ بے گناہ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ مگر اس شخص کی نفرت میں کمی نہیں ہوئی۔ اللہ میاں نے رسی ڈھیل چھوڑی ہوئی ہے۔ اچھا جیسے اس مولا کی مرضی۔"

بن یامین نے گفتگو کا ایک ایک لفظ نانی کے گوش گزار کر دیا۔ اور گفتگو تھی ہی کتنی۔ حُور بانو کو لیلے کے نام سے پکارتے ہوئے اس شخص کو شرم تک نہ آئی۔

ثنا اپنی ماں کی بے بسی۔ بے وقعتی کا احساس کر سکتی تھی۔ اور جب خیال آتا، آنکھیں جل اٹھتیں دل سے دھواں نکلنے لگتا۔

"جب کہو گی۔ میں تمہیں لے چلوں گا۔" بن یامین نے بھی خشک لہجہ اپنا لیا۔

"مگر۔ یہ ابھی سے سوچ لو۔ وہاں کوئی ناز اٹھانے والا نہیں ہے۔ سیدھے منہ بات کرنے کا اس گھر میں رواج نہیں۔ اور۔ مجھے تو اپنے سلوک سے وہ صرف توڑتے مروڑتے ہیں، مگر میں سخت جان ہوں۔ بہت

لیتا ہوں۔ تمہیں۔ اس سے بھی کڑی سزا ملے گی کیونکہ تم۔ خالہ جانی کی بیٹی ہو۔ جنہوں نے ان کی مرضی کے خلاف۔ ماموں کے ساتھ جانے کی جرأت کر ڈالی تھی۔ جو آج بھی ان کے خیال میں ناقابلِ معافی جرم تھا۔ اس سے پہلے کے جرائم تو تھے ہی قابلِ گردن زدنی۔ اور ان کے حوالے سے تم پر بھی سختی ہو گی۔ پابندیاں لگیں گی۔ ہر وقت تمہاری ماں کے حوالے سے عزتِ نفس کو قتل کیا جائے گا۔ اور۔ تم وہاں سے آنا چاہو گی۔ تو آنے نہیں دیا جائے گا۔ اور۔ ان کے پسندیدہ شخص کے ساتھ شادی بھی کرنی پڑے گی۔"

یہ آخری جملہ اس نے زور دے کر کہا۔

"وہاں کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ اور اس جبر کو وہ اصول کا نام دیتے ہیں۔"

ثنا کی آنکھیں خشک تھیں مگر۔ نہ جانے کس طرح ہچکیاں گلے سے اُبل پڑیں۔ بن یامین نے نوٹس نہ لیا۔ وہ اس وقت بالکل اپنے باپ کی طرح کھردرا اور بے حس نظر آ رہا تھا۔

"اس کے علاوہ۔ ان کی بیگم۔ ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ اپنی بے اولادی کی سزا دینے میں۔ ان کا ثانی کوئی نہیں۔"

بن یامین جا چکا تھا۔ اور ثنا بے جان ہاتھوں کو گود میں لیے بیٹھی ایک ٹک دیوار کو گھورے جا رہی تھی۔ نوشتہ دیوار۔ پڑھنے کی کوشش، اور رات تک وہ بستر میں ہی گھسی رہی۔ کمرے سے نکلنے کو دل ہی نہ چاہا۔ وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ سوچنے کے لیے کوئی نکتہ ہی نہ تھا۔ کیسی دنیا ہے، اور کیسے دستور، انسان کی کتنی قسمیں ہیں، فطرتیں جدا جدا۔ قاعدے قانون۔ اور۔ یہاں ظالم کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں۔

کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ اُٹھ کر لائٹ جلانے کا خیال نہ آیا۔

دل میں روشنی تھی۔ اس روشنی میں راستہ نظر آ سکتا تھا، منزل نہیں۔ منزل تو جانے کہاں گم ہو گئی۔

فیضی انکل نے پھر۔ اس کی خبر ہی نہ لی۔ آذر شاید مایوس ہو کر چلا گیا۔ دماغ میں سناٹوں کا راج تھا۔ اور کمرے کے باہر۔ آوازوں کا۔

ہما بولتی ہوئی آئی۔ کھٹ۔ کمرا تیز روشنی سے بھر گیا۔

"یہاں گھسی ہوئی ہو۔ اور میں کہاں کہاں تلاش کرتی رہی۔ چلو اٹھو۔"

وہ خالی نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔ نہ جانے یہ اب بھی مجھ سے خفا ہے، یا ختم کر دی خفگی۔

"ارے اٹھو۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ وہ جیسے گہری نیند سے جاگی۔

"ہما۔ سچ بتاؤ۔ تم نے مجھے معاف کر دیا؟ اب خفا تو نہیں ہو۔"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ دراصل ہم نے اب اپنی منزل پا لی ہے۔" کچھ اترا کر بولی۔

"منزل۔"

"ہاں۔ جب تم اور آذر بات کر رہے تھے۔ تم ان سے میری سفارش کر رہی تھیں۔ میں اسی وقت اپنی بلاوجہ کی خفگی پہ شرمندہ ہو گئی۔ مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ ثنا! کسی سے اپنی مرضی سے محبت کی جا سکتی ہے۔ اس کو مجبور تو نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ضد والی بات ہو گی۔ اور میں ضدی نہیں ہوں۔ اور پھر۔ میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں، خفا کیسے ہو سکتی ہوں۔"

"شکریہ۔"

"شکر بعد میں ادا کرنا، دادی نے تم کو بلایا ہے۔"

ایک بار پھر۔ نانی سے مشورہ کر لوں۔ اس نے سوچا، باپ کے گھر جو بھی سلوک ہو۔ وہ آخر تو باپ ہے۔ کبھی تو بیٹی کی محبت دل میں جگہ بنائے گی۔

"اپنا حلیہ درست کر لو۔ کچھ لوگ بھی آئے ہوئے ہیں۔" ہما نے شرارت سے کہا۔

"لوگ۔ آئے ہوں گے میری ماں کا پُرسہ دینے۔ اور باپ کی زندگی کی نوید۔ میں خود کو یتیم سمجھتی رہی۔ اب پتا چلا۔ باپ زندہ سلامت ہے۔"

"لو۔ یہ کپڑے میں پریس کر رہی ہوں۔ تم اس کا دوپٹہ صبا سے لے لو۔ وہ اس پہ بیل لگانے کے لیے لے گئی تھی۔" ہما جلدی جلدی استری کر رہی تھی۔

"یہ۔ اتنے کامدار کپڑے پہنوں گی میں؟"

"ہاں۔ کیونکہ آج تمہارے بھائی بن یامین کی صبا کے ساتھ باقاعدہ منگنی ہو رہی ہے۔"

"ایں؟ کب — یعنی — کس نے کہا۔"

"دادی نے خود کہا — ابھی کہا۔ چلو تم دوپٹہ لاؤ۔ بس کپڑے تیار ہیں۔"

وہ تیزی میں نکلی۔ بن یامین کی منگنی کا سُن کر پہلے تو شاید کوئی خوشی نہ ہوتی، بلکہ صبا کی قسمت پر افسوس ہوتا، مگر جب سے اسے اس نئے رشتے کا علم ہوا تھا۔ بن یامین خاندان بھر کے لڑکوں میں ممتاز اور بہترین لگنے لگا تھا۔ وہ صبا کی قسمت پر رشک کرنے لگی۔

حسبِ معمول صبا کچن میں تھی۔ ماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ مامی کی آواز آ رہی تھی۔ وہ تواتر سے کوئی بات کہہ رہی تھیں۔ صبا نے کچھ پوچھا تھا۔

ثنا قریب گئی تو اس نے ثنا ہما مامی نے کہا۔

"ارے ظلم سا ظلم۔ اتنا بیمار تھی حوری۔ بے بنیاد الزام لگا کر پھر مارا بھی تھا۔ نہ کمزوری پر ترس آیا۔ نہ بچی پہ رحم کیا۔ وہ چھپاتی تھی ثنا کو۔ کہ ظالم کی نظر نہ پڑ جائے۔ کبھی پلنگ کے نیچے۔ کبھی الماری میں۔ کبھی بن یامین کے پاس چادر اوڑھا کر لٹا دیتی۔ وہ بچارا اسے سنبھالتا۔ لندن میں دو دفعہ گلا گھونٹا بچی کا۔ بس قسمت تھی بچ گئی۔"

"تو اب — بلا رہے ہیں اسی بیٹی کو۔"

"ہوگی کوئی مصلحت۔ مگر مجھے خیر کی امید نہیں شرافت نے اور ان کی دلہن نے بتایا تھا۔ حوری کو جب امید ہو گئی کہ وہ لیلین سے دور اور محفوظ ہے تو اس کو بچی کی خاطر زندہ رہنے کی امنگ بھی ہوئی۔ اور وہ صحت مند ہونے لگی۔ تو کم بخت نے۔ خدا غارت کرے۔ طلاق نامہ بھیج دیا۔ یہ وجہ لکھی کہ جو عورت شوہر کے احکام کی پابندی نہ کرے۔ وہ بیوی کہلانے۔ گھر میں رکھنے کے لائق نہیں۔"

"امی — کیا — طلاق؟ اس حال میں بھی؟"

"ہاں — اور اس آخری تیر نے اس بچاری کو بُری طرح گھائل کر دیا۔ طلاق نامہ ملتے ہی وہ بے ہوش ہوئی تو پھر ہوش نہ آیا۔ بے ہوشی میں ہی اس نے خود پر ڈھائے گئے مظالم۔ بچی پر کیے گئے ستم کو ٹکڑے ٹکڑے لفظوں میں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بتایا تھا کہ کس طرح وہ — فیضان کا نام لے کر اس معصوم حیادار لڑکی کو داغدار کرتا تھا۔ بہتان تراشی کرتا۔ اور سگریٹ سے اس کا چہرا جلاتا۔ ارے ایک ظلم ہو تو بتاؤں۔ اسی لیے گھر میں داخلہ بند ہے۔ کم بخت نے بچی کو قتل کر کے سکون حاصل کرنے کی قسم کھائی تھی۔"

"امی! یہ کیسے باپ ہیں؟" صبا حیرت سے کہہ رہی تھی۔

"یہ بے ضمیر۔ جابر اور کینہ پرور لوگ ہیں بیٹا! اللہ بچائے۔"

صبا باہر نکلی تو اس نے ثنا کو کچن کے باہر سیڑھی پر پڑا دیکھا اور شور مچا دیا۔ مامی فوراً آ گئیں۔

"میں ٹھیک ہوں صبا!" اس نے کمزور آواز میں کہا۔ "چکر آ گیا تھا۔"

نانی کے کمرے میں صرف نانی بیٹھی تھیں۔ تینوں بہنیں جب داخل ہوئیں تو انہوں نے ان کی بلائیں لے ڈالیں۔ اور اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔ ثنا تو ابھی تک نقاہت سے لڑکھڑا رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کسی تقریب کا سماں پیش کر رہا تھا۔ ہاں، صبا کی منگنی۔ مگر یہ کیا۔ فیضی انکل نے اسے تھام کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور فیضی آنٹی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک انگوٹھی پہنا دی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی، منگنی تو صبا اور بن یامین کی ہے۔

مگر وہاں تو اجتماعی منگنیاں تھیں۔ جب خالہ امی نے ہما کو انگوٹھی پہنائی اور نانا نے صبا کو۔ تو سب نے بلند آواز میں ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کس کی، کس سے منگنی ہوئی۔

"دو جوان بیٹیوں کے جنازوں کا بوجھ اٹھائے اٹھائے بوڑھی ہو گئی تھی۔ تھک گئی تھی میں۔"

نانی فیضان کے سر پہ ہاتھ رکھے بھاری آواز میں کہہ رہی تھیں۔

"آج وہ بوجھ اُتر گیا۔ فیضی! تمہاری مقروض تھی میں۔ امانت میں خیانت کی مجرم تھی۔ آج تمہارا، میرا حساب بے باق ہوا کہ نہیں — ؟" وہ بلکنے لگیں۔

فیضی انکل نے نانی اماں کو تھام کر صوفے پر بٹھایا۔ ان کی گود میں سر رکھ کر چند منٹ بیٹھے رہے۔ ان کے پیر فرش پر اور سر نانی کی آغوش میں تھا۔ پھر سر اٹھا کر انہوں نے نانی سے کہا۔

"آپ بزرگ ہیں۔ میں آپ کو الزام نہیں دوں گا۔

یہ سب قدرت کے اشارے پر ہوتا ہے۔ میں آپ کی عنایتوں اور مہربانیوں کا احسان مند ہوں۔ ہاں آج میرا آپ کا حساب صاف ہو گیا۔"

"یہ — کیا ہو رہا ہے۔" ثنا نے ہما کا کندھا نوچ لیا۔

"میری منگنی۔" معصومیت سے بولی۔

"کس سے — مگر — ؟"

"آذر سے نہیں —" وہ ہنس پڑی۔ اکرم بھی کھلا کھلا نظر آیا۔

"بالکل نئی انگوٹھی ہے۔ دیکھ لو۔ پُرانی انگوٹھی پہنانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔" وہ ہما کو دیکھ دیکھ کر پھولا نہ سما رہا تھا۔

ثنا کو حیرت سے اپنی طرف دیکھتا پا کر بولا "غلط راستے پر چل پڑا تھا، اب صحیح راستہ ملا ہے۔ سوری! تمہیں ڈسٹرب کیا۔"

"اور مجھے تو راستہ مل ہی نہیں رہا تھا۔ اب بھی مل کر نہیں ملا۔ کوئی کچھ بتاتا نہیں۔" وہ اُلجھن میں گرفتار اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

آذر کہیں نظر نہ آیا۔ صبا نے اسے ٹھوکا دیا۔

"ہوں — ہوں — تم دلہن بنی ہوئی ہو، اِدھر اُدھر مت دیکھو۔"

"وہ — وہ —" زبان اٹک گئی۔

"وہ اختر بھائی کو لینے ایئرپورٹ گئے ہیں — اور اختر بھائی تمہارے نکاح کے سلسلے میں آ رہے ہیں۔ جو — کل ہونا ہے۔"

"ک — ک — کیا۔ ک — کس — ؟"

"یہ راز ہے۔" اکرم موٹی آواز میں بولا۔ سب ہنس رہے تھے۔

اب اسے اصلی باپ کے گھر نہیں جانا۔ روحانی باپ کے ساتھ جانا تھا۔ یہ بات معلوم ہوتے ہی روح کی گھٹن اور نقاہت یک لخت ختم ہو گئی۔

جہاں محبت۔ رواداری۔ حسنِ سلوک کے چراغ جلتے ہیں، وہاں پاکیزہ شبنم میں بھیگے مہکتے گلاب کھلتے ہیں۔

یہ سب قدرت کے اشاروں پہ ہوتا ہے، اور قدرت مہربان ہو تو نفرت کی زنجیریں ٹوٹ جایا کرتی ہیں۔

اس نے آج قدرت کے فیصلے پر شکرانے کے طور پر اصلی باپ کے سب قصور، تمام جبر معاف کر دیے، سوائے آخری تیر زنی کے۔

نانا نے آج پھر پُرانا کیسٹ لگا دیا تھا۔

(بابل مورا نیہر چھوٹو جائے۔ بابل مورا نیہر چھوٹو ہی جائے بابل۔ (مگر۔ آج تو دادا کی دادی سے جنگ نہیں ہوئی)۔

اور تمام خواتین آنکھیں چُراتی اور پلکیں مسلتی پائی گئیں۔

بابل کا نام ہی — درد و محبت۔ شفقت۔ پناہ تحفظ کا نام ہے۔

اور ہر عورت اس لفظ پہ پلکیں ضرور بھگوتی ہے۔

مگر ثنا — بابل کا گھر چھوڑ کر نہیں۔ بابل کے گھر جا رہی تھی۔

اس لیے اس کی پلکیں خشک تھیں۔ لب مسکرا رہے تھے۔

اس کا دل چاہ رہا تھا۔ کوئی پہاڑی گیت بھی الاپے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہو۔ کہ

اے میرے بابلا! میری محبت صرف تیرے لیے ہے، میں تیری عنایت کی مستحق ہوں۔ اے کاش تو نے میری ماں کے نرم گرم جذبات کا احساس کیا ہوتا، اور اس کے سینے میں وہ نفرت و انتقام کا تیر پیوست نہ کیا ہوتا۔ جس نے تیری معصوم بیٹی کو ممتا کی گرمی سے محروم کر دیا۔ اے میرے بابل!۔ جانیں نے تجھے اپنی ماں کا خون بخشا۔ ایک خوش کن۔ خوش آگیں امید کے سہارے۔

(تیرے دل میں رحم و محبت کے چشمے اُبلنے کی توقع میں)

میرے بابلا — وقت تجھ سے پچھتاوے کی شکل میں اس تیر کا حساب مانگے۔ جو تو نے ایک باحیا، باکردار عورت کے زندہ سینے کی زینت بنایا۔ جو محبت کرنے کے جُرم میں تیری نفرت کا شکار بنی۔ (جو محبت کے خمیر سے گوندھی گئی، محبت کے جُرم میں ماری گئی۔)

تو اے میرے بابل۔ تو میرے پاس آ جانا میں تجھے وہ تو پیار۔ وہ سائبان دوں گی جو تیرے پاس میرے لیے نہ تھا۔ خدا سے تیری بخشش کی دعا کروں گی۔

کہ ہی میری تجھ سے چاہت کا [illegible] ہو گی

اسے میرے بابلا۔ اسے میرے بابلا!!